تقلید و اجتہاد

از

مسیح الامت حضرت مولانا شاہ محمد مسیح اللہ خان صاحب شروانی مدظلہم

از اکابر خلفاء

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ

مکتبہ فیض اشرف جلال آباد مظفر نگر

۱۳۸۷ھ

فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون ۝

رسالہ تقلید و اجتہاد

از افادات

قدوۃ السالکین زبدۃ العارفین مسیح الامۃ حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحب مدظلہ

از اجلۂ خلفاء

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

ناشر

مکتبہ فیض اشرف جلال آباد ضلع مظفر نگر

(یو، پی - انڈیا)

نام کتاب ———— رسالہ تقلید و اجتہاد

تالیف ———— مسیح الامۃ حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب مدظلہ

طبع اوّل ———— رمضان المبارک سنہ ۱۴۰۱ھ م جولائی سنہ ۱۹۸۱ء

ضخامت ———— ۱۱۲ صفحات

تعداد اشاعت ———— ایک ہزار

قیمت ———— ۷/=

ناشر ———— (مولانا) سید عبد الرحیم مالک مکتبہ فیض اشرف جلال آباد ضلع مظفر نگر

کتابت ———— فضل الرحمٰن دربھنگوی

مطبوعہ ———— شروانی آفسٹ پریس دہلی

ملنے کے پتے

(۱) مکتبہ فیض اشرف جلال آباد ضلع مظفر نگر (یو، پی)

(۲) مولانا وکیل احمد صاحب بیت الاشرف ۸، ۷/A ماڈل ٹاؤن لاہور (پاکستان)

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

اما بعد قال اللہ تعالیٰ فی القرآن المجید فَاسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انما شفاء العِیِّ السُّؤَالُ ۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے اگر تم نہیں جانتے تو جاننے والوں سے پوچھ لیا کرو۔ اور حدیث پاک کا ترجمہ یہ ہے کہ پس ناواقف کی شفاء معلوم کرلینا ہے یعنی ناواقفی (جہالت) ایک مرض ہے جس کی دوا اہل علم سے معلوم کرلینا ہے۔ اس آیت شریفہ وحدیث پاک سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ احکام سے واقف ہوتے ہیں اور بعض ناواقف ــــــ ناواقفین کے ذمہ واقفین سے پوچھ لینا ہے، تو ناواقف اتباع مسائل واحکام میں واقفین اور علماء کا محتاج ٹھہرا، اور اس کو لازم ہوا کہ کوئی ایسا عالم باعمل جو متقی اور پرہیزگار ہو۔ احکام شریعت جاننے کے لئے تلاش کرے، اور ہر مسئلہ میں اس کی اقتداء کرے ــــــ اس طرح ایسے عالم و متقی کے اتباع کرنے کو تقلید شخصی کہتے ہیں جس کا اجمالی ثبوت نقلی آیت شریفہ اور

حدیث پاک مذکور سے ہو ہی چکا جو کافی ہے، لیکن یہ تقلید شخصی وہ چیز ہے کہ عامی و خاصی ہر ایک کی عقل بھی اس کی ضرورت پر شاہد ہے۔

زیر نظر رسالہ میں بعنوان عام و خاص اسی ضرورت تقلید شخصی کو بتوفیقہٖ تعالیٰ ثابت کیا گیا ہے جس سے ایک منصف مزاج پکار اٹھے گا کہ واقعی حفاظتِ دین کے لئے تقلیدِ شخصی نقلاً واجب اور عقلاً ضروری ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

نَحۡمَدُہٗ وَنُصَلِّیۡ عَلٰی رَسُوۡلِہِ الۡکَرِیۡمِ

ثبوت تقلید بعنوان عام

صاحبو! اگر ہم اپنے ماں باپ اور اساتذہ کی تقلید نہ کرتے تو آج انسانیت کی نہایت ابتدائی ضرورتوں سے بھی محروم ہوتے۔ ہم میں ہوش و حواس پیدا ہونے سے پہلے تقلید، یعنی دوسرے کے نمونہ پر کام کرنے اور نقل اتارنے کا مادہ موجود تھا، اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم اپنی مادری زبان بھی نہ سیکھ سکتے، اگر استاذ کی ہر بات بے چوں و چرا نہ مانتے، اس کے ہر اشارہ کی بلا دلیل تعمیل نہ کرتے تو الف، باء یعنی حروف تہجی سے بھی واقف نہ ہوتے، کتابوں کا پڑھنا اور لکھنا تو بڑی بات تھی، ہمارا کھانا، پینا، اوڑھنا، پہننا، چلنا، پھرنا، روزی کمانا، کھیتی کرنا اور تمام ضروریات زندگی کا فراہم کرنا اسی تقلید سے وابستہ ہے، مکتب یا مدرسہ میں استاذ کی تقلید ہماری دماغی اور اخلاقی نشو و نما کا موجب بنتی ہے۔

ہر ایک علم اور ہر ایک فن کی اصطلاحات اور مبادیات اگر تقلیدی طور پر بلا چوں و چرا یاد نہ کی جاتیں تو کوئی علم و فن حاصل نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لغات و محاورات کے معانی و مطالب اگر مقلد بن کر نہ سیکھیں تو عربی و فارسی وغیرہ کسی بھی زبان کے زبان داں نہیں بن سکتے۔

سانپ اور سنکھیا کا واجب الہلاکت ہونا اور بہت سی دواؤں کا موجب شفاء امراض ہونا بھی ہم کو تقلیدی طور پر معلوم ہوا۔

میدانِ جنگ میں لڑنے والی فوج اگر اپنے سپہ سالار کے ہر ایک حکم پر بلا چوں و چرا تعمیل نہ کرے تو کبھی فتحمند نہیں ہو سکتی، اور ذمہ دار حاکموں کے ماتحت کارکنان اگر حکام کی بلا دلیل تعمیل نہ کریں تو ملک کا انتظام اور امن و امان ہرگز قائم نہیں رہ سکتا۔

غرض ہماری تمام جسمانی، روحانی، دماغی، علمی، اخلاقی اور معاشرتی ترقیات اور کمالات کی بنیاد تقلید اور بلا چوں و چرا ماننے پر رکھی گئی ہے، حتیٰ کہ خدا تعالیٰ کی رضامندی بھی اتباع و تقلید کے ذریعہ حاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ قرآن مجید میں ارشاد ہے مَآ اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰىكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم، جو چیز تم کو دیں اس کو لے لو، اور جس چیز سے تم کو منع کریں

روکیں، بس رک جاؤ۔

معلوم ہوا کہ کم جاننے والوں اور بالکل نہ جاننے والوں کے لئے اپنے سے زیادہ جاننے والوں کی تقلید کرنا اور اسی ذریعہ سے ترقی کی منازل طے ہونا انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور یہی تقلید تمام ترقیات کا موجب ہوتی ہے۔

لیکن اگر مقتدا، جس کی تقلید کی جاتی ہے خود غلطی پر ہو یا دانستہ ہمارے سامنے اپنا غلط نمونہ پیش کرے تو اسی تقلید کی بدولت ہم گمراہ اور غلطی میں مبتلا ہو سکتے ہیں، اور بجائے کامیابی اور ترقی کی منازل طے کرنے اور ترقی پر پہنچنے کے ناکامی اور پشیمانی کا منھ دیکھنا ہوگا، پس تقلید کے لئے انسان مجبور ہے تو اس پر یہ بھی لازم ہے کہ جو عقل مستقیم اور فہم سلیم اور فراست صحیحہ و صادقہ انسان میں ودیعت فرمائی ہے اس سے کام لے تا وقتیکہ خارجی اثرات سے عقل و فہم میں اور فراست میں نقص اور خرابی و کجی نہ پیدا کرلی ہو، اور جس کی تقلید کرنا چاہتا ہے اس میں نظر و فکر کرے، کیونکہ ضروری چیزوں کے سیکھنے اور کسی کی پیروی کرنے کو حصول ھدایت اور اتباع و اطاعت کہتے ہیں، اور یہ حدود شرع سے باہر نہیں ہوتی۔

بعنوان عام

وجوب تقلید کی دوسری نوعیت

صاحبو! کمزور اور بچے کو اپنے سے زیادہ طاقتور با اختیار کی اور والدین اور دوسرے بزرگوں کی تقلید کرنی پڑتی ہے جو اس سے محبت بھی کرتے ہیں اور اس کے محسن بھی ہوتے ہیں، لہٰذا انسانی فطرت میں یہ بات مرکوز ہے کہ ہر ایک طاقتور اور ہر ایک محب و محسن اس قابل ہے کہ اس کی تقلید اور پیروی کی جائے۔ انسانی فطرت کے اسی تقاضے کو مدنظر رکھتے ہوئے خدا تعالیٰ نے قرآن مجید میں اطاعت والدین کو ضروری قرار دیا ہے، اور اس امر بدیہی کیساتھ جو کہ وہ استدلالاً مقدم ہے جابجا اپنی طاقت و قدرت اور اپنے احسانات کی طرف انسان کو توجہ دلائی ہے اور اس سے فرمانبرداری چاہی ہے۔

انسان جس طرح دوسروں کی طاقت و احسان سے متاثر ہو کر اطاعت و فرمانبرداری پر آمادہ اور طیار ہو جاتا ہے، اسی طرح وہ اپنے کو دوسروں سے زیادہ طاقتور اور دوسروں کا محسن یقین کرتا ہوا ان سے اپنی اطاعت

چاہتا ہے۔ چنانچہ باپ کو بیٹے سے، استاذ کو شاگرد سے، بادشاہ کو رعایا سے اور ہر حاکم کو محکوم سے اطاعت و فرمانبرداری کی توقع ہوتی ہے، اور جب کئی طاقتوروں کی طاقتوں اور کئی محسنوں کے احسانات میں مقابلہ پیش آجاتا ہے تو عقل کا فیصلہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوسکتا کہ سب سے بڑے طاقتور اور سب سے بڑے محسن کو دوسرے طاقتوروں اور دوسرے محسنوں پر مقدم رکھا جائے، اور تضاد واقع ہو تو بلاتامل بڑے کی فرمانبرداری اختیار کی جاوے اور چھوٹے سے عذر کردیا جاوے، لیکن جب بڑے چھوٹے میں امتیاز نہ کیا جائیگا تو انسان لازماً صراط مستقیم، راہ حق اور مقتضائے عقل سلیم سے بھٹک جائے گا جدا ہوجائے گا۔

پس جب یہ سمجھ میں آگیا تو عقل بتلاتی ہے اور اسی کو شریعتِ اسلام انسان کو بتاتی اور سمجھاتی ہے کہ خدا کے برابر کوئی طاقتور نہیں ہے اور نہ کوئی اس کے برابر قوتوں کا مالک ہے اور نہ کوئی خدا تعالیٰ کے مانند محسن ہے، لہٰذا خدا تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری سب پر مقدم ہے، بس اسی کو سب پر مقدم رکھو، اور خدا تعالیٰ کے حکم کے موافق اس کے رسول کی اطاعت اور اسی کے حکم کے موافق ماں باپ اور اولوالامر کی فرمانبرداری کرو، یہی عقل کا تقاضا ہے اور یہی نور فراست

کا مقتضی ہے۔

اسی فطری قاعدے کے مطابق وہ ائمہ عظام جو علوم دینیہ اور تقوی وطہارت میں ہم سے بہت بڑے ہیں، جنہوں نے پوری زندگیاں صرف کر کے پورے صلاح و تقوی کے اوصاف کے ساتھ ان علوم دینیہ کو حاصل فرمایا، قرآن و حدیث آثار و سیر ناسخ و منسوخ لغات و معانی پر ان کی پوری پوری نظر تھی۔ ہمارا علم ان کے مقابلے میں ایسا ہے جیسا کہ کسی جید ماہر عالم کے سامنے ایک طفل مکتب کا علم، تو اب ہمارے ذمہ اس فطری قاعدے کے مطابق لازم ہے کہ ہم مسائل اجتہادیہ میں ان ائمہ کرام کی تقلید کریں، پس معلوم ہوا کہ تقلید تو فطری اور پیدائشی حق ہے۔

مانع تقلید

اب سوال یہ ہے کہ جب فطرت کا اور عقل کا بھی یہی تقاضا ہے تو اس کے خلاف تقلید سے کیا مانع ہے، جواب ظاہر ہے کہ انسان جب عقل کی روشنی سے کام لینا اور فائدہ حاصل کرنا چھوڑ دیتا ہے تو شیطانی و نفسانی اندھیروں تاریکیوں میں آزاد و آوارہ ہو کر فطرت و عقل کو برباد کر دیتا ہے۔ ہوائے نفسانی کی لہروں میں بہنے لگتا ہے، جب ایسا ہوتا ہے تو آزادانہ زندگی میں حقیقت ایمان و اسلام سے آزاد و بے پرواہ ہو کر خواہش نفسانی

وکید شیطانی کے آگے ہو لیتا ہے۔

اب اس خیال سے کہ برادری سے بھی نہ کٹ جاوے اور سرخرو بھی رہے، اپنے ناشائستہ اور غیر شرعی، کتاب و سنت کے خلاف اعمال کو شائستہ اور شرعی ثابت کرنے کے لئے شرعی جواز کی صورتیں کسی نہ کسی طرح نکالنے کی کوشش کرتا ہے۔

اب ایسے شخص کے سامنے جب آیات واحادیث کے صاف صاف احکام کو پیش کیا جاتا ہے تو وہ آیات مأولہ ومبہمہ اور مشتبہات ومشترکۃ المعانی ومجازات کو پیش کرتا ہے۔ اور کبھی آیات واحادیث کے الفاظ کا مفہوم حسب منشاء متعین کرلیتا ہے اور اپنے عمل کو اس پر منطبق کرتا ہے، ایسے ہی وقت کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ انما اخاف علی امتی الائمۃ المضلین، (رواہ ابوداؤد والترمذی) کہ میں اپنی امت کے متعلق گمراہ کرنے والے اماموں سے ڈرتا ہوں یعنی ایسے پیشواؤں سے خطرہ ہے کہ یہ اپنی ہر ایک بات کو قرآن وحدیث سے مدلل کرکے پیش کرتے ہیں اور شریعت کی رخصتوں کو اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ گویا ان رخصتوں ہی کو نصوص کا مرتبہ حاصل ہے، اور اس کے سوا دوسری صورت قطعاً باطل ہے، آیات منسوخہ اور احادیث ابتداء اسلام کو حجت میں آڑ بناتے ہیں

اور مرجوح کو راجح قرار دیتے ہیں یا مقید کو بحذف قید مطلق رکھتے ہیں یا کسی صحابی کے وقتی جزوی ضرورت کے حکم کو، حکم عام میں داخل کرتے ہیں یا بدون تحقیق ثقاہت راوی و بلا فرق ملازمت راوی اور بلا امتیاز قوت و ضعف روایت اور بلا غور آیات محکمہ و متشابہہ، و صریح و محتمل المعنی، بلالحاظ معنی عام و خاص، حقیقت و مجاز و مشترک اور بمقابل نص، قیاس کو ترجیح دے کر خلاف معنی مطلوب و مراد شارع علیہ السلام من مانے معنی مراد لے کر سہل الحصولی، تن آسانی کو معیار زندگی بناتے ہیں جو کہ اباحتی زندگی کی دلدادگی کی دلیل ہے، اور شریعت اسلامی کی حقیقی روح کو فنا اور عبد و معبود کے درمیان اصل تعلق کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔

نیز اس طرح اسلام کو پیش کرنا قلب میں للّٰہیت پیدا کرنے اور خشیت و محبت الٰہی کا شعلہ بھڑکانے سے بالکل عاری ہے، کہ اغوائے شیطانی اور ہوائے نفسانی سے اپنی سہل الحصولی اور تن آسانی کی خاطر بمقابل منصوصات و مفسرات و منقولات صحابہ و ائمہ متقدمین و علماء محققین، اپنی رائے اور قیاس کو ترجیح دیتا ہے، اور یہ بالکل ایسا ہے جیسا کہ شیطان نے اپنی ہوائے نفس سے بمقابل نص سجدۂ آدم علیہ السلام کو قیاس کیا، اور سجدہ منصوصہ کے حکم سے انکار کر دیا، عملاً

بھی انکار کیا اور لساناً بھی، اور دلیل میں قیاس کے مقدمات کو پیش کیا کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ جو کہ بظاہر سطحی نظری سے صحیح اور قوی معلوم ہوتے تھے اور جن سے اس کی توحید بڑی ستھری خالص سمجھی جاتی تھی لیکن اَمْرُ تُكَ نے اس کی دلیل کو رد کر دیا اور اس کو قیامت تک مردود قرار دیدیا۔

بخلاف ان کے جو اپنی نفسانی خواہشات سے مغلوب نہیں ہوتے وہ حریت پسندی اختیار نہیں کرتے بلکہ عقل مستقیم اور فہم سلیم اور تدبر و بصیرت سے بخوف بازپرس روز قیامت کام لیتے ہیں، وہ اغوائے شیطانی و ہوائے نفسانی سے محفوظ اور صراط مستقیم، راستبازی و نیک کرداری پر قائم رہ کر صحیح مطالب کے ہادی و مہتدی ہو کر فائز المرام ہوتے ہیں اور تقلید ہی کو اپنے لئے حفاظت اور فتحمندی کا ذریعہ بعقل مستقیم جانتے ہیں۔

غرض مختلف طرق سے ثابت ہوا کہ اصل اور فطری چیز تقلید ہے سکون و اطمینان تقلید ہی میں ہے۔

پس اس کے لئے چند امور کے جاننے معلوم کرنے کی ضرورت ہے۔

(۱) شریعت میں تقلید کی حقیقت و حیثیت کیا ہے؟

(۲) کیا تقلید شخصی واجب ہے اور بصورتِ وجوب ائمہ اربعہ ہی میں کسی ایک کی تقلید کیوں ضروری ہے ؟

(۳) اجتہاد اور مجتہد کی تعریف اور اس کے حدود۔

(۴) قیاس ورائے میں کیا فرق ہے ؟

باسمہ وحمدہ تعالےٰ

تقلید

تقلید کی تعریف - تقلید یہ ہے کہ کسی کا قول محض اس حسن ظن پر مان لیا جائے کہ یہ دلیل کے موافق ہی بتلا دے گا، پھر اس سے دلیل کی تحقیق نہ کرنا۔

دلیل عن الاسود بن یزید قال اتانا معاذ بالیمن معلما واميرا فسالناه عن رجل توفی وترك ابنتہ واختا فقضی للابنة بالنصف وللاخت النصف، ورسول الله صلی الله علیه وسلم حی (کتاب الفرائض فصل ثانی بخاری شریف، ابوداؤد شریف)

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ زمانہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم میں تقلید جاری تھی، دیکھو سائل نے دلیل دریافت نہیں کی محض حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے تدین پر اعتماد کرتے ہوئے ان کی بات قبول کرلی، یہی تقلید ہے۔

پھر حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے فرمائے ہوئے جواب پر حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کے زمان مبارک میں جو لوگوں نے اتباع کیا، اس پر نہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار ثابت نہ کسی اور سے اختلاف اور رد منقول، پس اس سے تقلید کا جائز ہونا ثابت ہو گیا اور بالخصوص وہ بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مبارکہ میں بلا نکیر اس تقلید کا شائع ہونا۔

نیز اس حدیث سے تقلید شخصی کا بھی ثبوت ہے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو تعلیم احکام کے لئے یمن بھیجا تو یقیناً اہل یمن کو اجازت دی کہ وہ ہر مسئلہ میں ان سے رجوع کر سکتے ہیں اور یہی تقلید شخصی ہے۔

دوسری دلیل :- عن ھذیل بن شرحبیلؒ قال سئل ابو موسیٰ ثم سئل بن مسعود واخبر بقول ابی موسیٰ فخالفہ ثم اخبر ابو موسیٰ فقال لاتسألونی مادام ھذا الحبر فیکم (اخرجہ البخاری وابوداؤد والترمذی۔ کتاب الفرائض فصل ثانی)۔

حضرت ابو موسیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس فرمانے سے کہ ان (ابن مسعودؓ) کے ہوتے ہوئے مجھ سے نہ پوچھو۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہر مسئلہ میں ان سے پوچھنے کو فرمایا اور یہی تقلید شخصی ہے کہ ہر مسئلہ میں کسی مرجح کی وجہ سے ایک ہی عالم سے رجوع کر کے

عمل کیا کرے۔

اِن احادیث سے معلوم ہوا کہ تقلید شخصی کوئی نئی اور قابل انکار چیز نہیں، بلکہ خیر القرون ہی سے اس کا وجود ثابت ہے۔

تقلید شخصی کا وجوب

وجوب کی دو قسمیں ہیں، ایک وجوب بالذات، دوسرے وجوب بالغیر، جن چیزوں کی قرآن و حدیث میں فعلاً یا ترکاً تاکید ہے ان کے لئے وجوب بالذات ثابت ہے، جیسے نماز، روزہ وغیرہ یہ چیزیں واجب بالذات کہلاتی ہیں۔

دوسرے وہ امور جن کی خود تو تاکید نہیں آئی مگر جن امور کی قرآن وحدیث میں تاکید آئی ہے ان امور پر عمل کرنا بدوں اِن امور کے اختیار کئے عادۃً ممکن نہیں، مطلب یہ کہ خود امور منصوصہ تو نہیں البتہ امور منصوصہ کے موقوف علیہا ہیں، توان امور موقوف علیہا کو واجب بالغیر کہا جاتا ہے، ان کے لئے لزوم و وجوب امور منصوصہ کے لئے ثابت ہوتا ہے، مسلّم قاعدہ ہے مُقَدّمَۃُ الْوَاجِبِ وَاجِبٌ اس کا یہی مطلب ہے۔

جیسے کتابت قرآن و حدیث، کہ حدیث میں اس کی نفی مصرّح ہے چنانچہ وارد ہے عن ابن عمرؓ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انا امۃ لا نکتب ولا نحسب (متفق علیہ مشکوٰۃ شریف)۔

اس میں مطلق کتابت کی نفی صراحۃً مذکور ہے نفی وجوب دلالۃً ہے، بایں ہمہ قرآن و حدیث کا لکھنا ضروری کہا گیا ہے اور اس کو حدیث کی مخالفت نہیں سمجھا گیا اور نہ اس کے واجب ہونے میں کلام کیا گیا نہ مطالبہ دلیل کیا گیا، اسی وجہ سے کہ قرآن و حدیث کا محفوظ رکھنا اور ضائع ہونے سے بچانا یہ وہ امور ہیں جن کی تاکید وارد ہے، ادھر تجربہ و مشاہدہ ہے کہ بدون مقید بالکتابۃ کرنے کے محفوظ رہنا عادۃً ممکن نہیں، اس لئے کتابت قرآن و حدیث کو ضروری اور واجب قرار دیا گیا اور اس طور پر اس کے ضروری ہونے پر تمام امت کا دلالۃً اتفاق و اجماع چلا آرہا ہے، ایسی ہی ضرورت کو وجوب بالغیر کہتے ہیں ٹھیک اسی طرح تقلید شخصی کو ضروری اور واجب کہا جاتا ہے، یعنی یہ تقلید واجب بالغیر ہے۔

لہٰذا تقلید شخصی کے وجوب کو ثابت کرنے کے لئے صراحت نص پیش کرنے کی حاجت اور ضرورت نہیں دلالت نصوص اس کے لئے کافی و وافی ہے جیسا کہ اہل علم پر مخفی نہیں۔ پس ہمارے زمانہ

ہیں چونکہ مقاصد دینیہ اور امور منصوص علیہا کی حفاظت بدون تقلید شخصی ممکن نہیں، اسلئے غالب احوالِ اشخاص پر نظر کرتے ہوئے تقلید شخصی بالکل ضروری اور لابدی و لازمی امر ہے۔

ترک تقلید کی خرابیاں

تفصیل اس کی یہ ہے کہ تجربہ و مشاہدہ ہے کہ اس وقت اکثر طبائع میں خود غرضی و غرض پرستی، غلبہ خواہشات و ہوائے نفسانی عدم اخلاص اور شر و فساد، اہل حق کے اجماع کی مخالفت، خواہشات طبع کو دین پر غالب کرنا، غالب طور پر پایا جارہا ہے جیسا کہ ظاہر ہے اور احادیث فتن میں اس کی خبر بھی دی گئی ہے جو اہل علم پر مخفی نہیں، اس لئے تقلید شخصی نہ ہونے سے دین میں سخت خلل واقع ہوگا، بڑی بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی۔

ایک خرابی یہ ہوگی کہ بعضے اپنے کو مجتہد سمجھ کر قیاس کرنا شروع کردیں گے، اور کہیں گے جیسا کہ کہا جا چکا ہے کہ جس طرح مجتہدین سابقین نے بعض نصوص کو معلل سمجھا اور وہ سمجھنا ان کا معتبر اور مقبول ہوا، اسی طرح میں کہتا ہوں کہ وضوء کا حکم نماز کے لئے معلل ہے کہ پہلے عرب کے لوگ اونٹ بکریاں چراتے تھے ہاتھ پاؤں آلودہ رہتے تھے چھینٹیں ہاتھ پاؤں اور منھ پر پڑتی تھیں اس لئے وضوء

کا حکم ہوا تھا کہ اعضاء پاک وصاف ہو جاویں، اور ہم روزانہ غسل کرتے ہیں مکانوں میں رہتے ہیں، ان چیزوں سے کوئی واسطہ نہیں کہ گندے میلے ملوث ہوں اس لئے ہم پر وضوء واجب نہیں بلا وضوء نماز پڑھنا جائز ہے۔

اسی طرح نکاح میں شہود کا وجوب معلل ہے، رفع خصومت کے لئے وجوب ہے کہ بروقت اختلاف زوجین تحقیق حال میں سہولت ہو، جہاں ایسا نہ ہو وہاں بلا شہود نکاح جائز ہے۔

اسی طرح کوئی دعویٰ کر سکے گا احکام منسوخہ بالاجماع کے غیر منسوخ ہونے کا، اور مثلاً متعہ کو جائز کہنے لگے گا، تو یہ کس قدر کھلم کھلا تحریفِ احکام اور مخالفت اجماع امت ہوگی۔

حالانکہ یہ سمجھ لینا کہ کون حکم معلل ہے علت کے ساتھ کہ مقیس علیہ اور مقیس اور علت سے تعدیہ ہو، اور کون حکم تعبدی یعنی غیر معلل ہے؟ یہ ائمہ مقبولین متورعین، مخلصین متقین، اغراض وخواہشات نفسانی سے دور رہنے والوں، فناء تام والوں، غالب علی النفس اور ذوق خاص رکھنے والوں کا مخصوص حصہ تھا جو ان پر ختم ہو چکا ہے۔

دوسری خرابی تقلید شخصی ترک کرنے سے یہ ہوگی کہ جن بعض احادیث کے ظاہر پر یقیناً عمل جائز نہیں تارک تقلید ایسی حدیثوں پر عمل

کرے گا، چونکہ وہ کسی کا پابند تو ہے ہی نہیں جدھر نفس لے چلے گا اُدھر ہی چلا جائے گا، مثلاً مسلم شریف میں حدیث ہے کہ صلی الظھر والعصر جمیعًا والمغرب والعشاء جمیعًا من غیر خوف ولا سفر کہ بدون خوف اور بدون سفر آپ ﷺ نے ظہر وعصر ایک ساتھ جمع کر کے اور مغرب وعشاء ایک ساتھ جمع کر کے پڑھیں۔ حالانکہ بلا عذر حقیقتاً جمع کرنا کسی کے نزدیک جائز نہیں جیسا کہ ظاہر حدیث سے مفہوم ہوتا ہے، اس لئے قوت اجتہادیہ سے تاویل کی جاتی ہے، پس اگر یہاں ظاہر حدیث پر عمل کیا جائے گا تو اجماع کی مخالفت لازم آئیگی جو کہ ممنوع اور حرام ہے۔

تیسری خرابی ترک تقلید اور آزادی سے یہ ہوگی کہ اگر اپنا اجتہاد بھی نہ کرے اور ظاہر حدیث پر بھی عمل نہ کرے تو یہ صورت اختیار ہوگی کہ مسائل مشکلہ میں بلا تعیین وبلا تخصیص کسی ایک امام کے اس طرح تقلید ہوگی کہ کبھی ایک مجتہد کے فتویٰ پر عمل کبھی دوسرے کے فتویٰ پر عمل ہو، تو اس طرح بعض دفعہ تو اجماع کی مخالفت لازم آوے گی اور بعض دفعہ اگر مخالفت اجماع بھی نہ ہوگی تو بوجہ غلبہ غرض پرستی وہوائے نفس، مسائل مختلفہ میں اسی قول کو لے گا جو اس کی خواہش کے موافق ہوگا، اور اس سے دنیوی غرض حاصل ہو، تو یہ شخص دین کو تابع

خواہش نفسانی کے بنائے رہے گا، عیاذا باللہ۔

پھر جب اس شخص کا نفس اس آزادی کا خوگر ہو جائے گا، کچھ عرصہ بعد اس آزادی کا فروع سے گذر کر اصول میں اثر پہنچ جانا جو دین کا صریح ضرر ہے کچھ بعید و عجیب نہیں بلکہ غالب و قریب ہے۔

پس بفضلہ و بحمدہ تعالیٰ مدعا یعنی تقلید شخصی کا وجوب ثابت ہو گیا، خلاصہ یہ ہے کہ تقلید شخصی مقدمہ واجب ہے اور واجب کا مقدمہ واجب ہوتا ہے، لہٰذا تقلید شخصی واجب ہے، رہا یہ کہ مقدمۂ واجب واجب ہوتا ہے اس کا کیا ثبوت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو مسلمات میں سے ہے اور بدیہی امر ہے، تمام اہل ملل اور اہل عقل کے نزدیک مسلم ہے، محتاج اثبات نہیں۔ تاہم تبرّعاً ایک حدیث شریف تائید کے لئے عرض ہے، عن عقبۃ بن عامرؓ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من علم الرمی ثم ترکہ فلیس منا او قد عصی۔ (رواہ مسلم)

اس میں تیر اندازی کے ترک پر وعید ہے، ظاہر ہے کہ تیر اندازی کوئی عبادت مقصودہ فی الدین نہیں مگر چونکہ بوقت حاجت ایک واجب یعنی اعلاء کلمۃ اللہ کا مقدمہ ہے اس لئے اس کے ترک پر وعید فرمائی جو کہ علامت ہے وجوب وقت حاجت کی، بس اس سے

ثابت ہوا کہ مقدمہ واجب کا واجب ہوتا ہے، بہرحال تقلید شخصی کا وجوب ثابت اور صحیح ہے۔

وجوب علی العموم

اس پر اگر یہ شبہ ہو کہ یہ تقلید شخصی تو اکثر طبائع کی ایسی حالت کے اعتبار سے ہے جس سے وہ مفاسد میں مبتلا ہو جاتی ہیں، لیکن جو شخص ایسا نہ ہو تو اس کے لئے تقلید کا وجوب کیوں ہو یا بلفظ دیگر پھر وجوب تقلید کا عام فتویٰ کیوں ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ایک مسلّم قاعدہ ہے کہ انتظامی احکام جو مفاسد سے بچانے کے لئے ہوتے ہیں ان میں اکثر ہی کا اعتبار ہوتا ہے اور اکثر طبائع کی حالت جیسا کہ اوپر ذکر کی ہے ابتلاء مفاسد کی ہے لہٰذا اس کے پیش نظر وجوب تقلید کا حکم عام ہے۔

اسی وجہ سے فقہاء کا ارشاد ہے کہ جس امر میں عوام کو ایہام ہو وہ خواص کے حق میں بھی مکروہ ہو جاتا ہے، بہرحال یہ قاعدہ ہے کہ للاکثر حکم الکل جو متعدد احادیث سے ثابت ہے مثلاً عن جابر عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم حین اتاہ عمر فقال انا نسمع احادیث من یھود تعجبنا افتری ان نکتب بعضھا فقال امتھوکون انتم کما تھوکت الیھود والنصاری (مشکوٰۃ)

حضرت عمرؓ نے حضرت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت

میں عرض کیا کہ ہم یہود سے کچھ باتیں سنتے ہیں جو بھلی معلوم ہوتی ہیں، آپ کی رائے عالی ہو تو ان میں سے کچھ (چیدہ چیدہ) لکھ لیا کریں، اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خفگی ظاہر فرمائی اور بالکل ممانعت فرمادی۔

تو غور فرمائیں کہ حضرت عمرؓ جیسے فہیم اور متصلب فی الدین شخص کو بھی اجازت ان باتوں کے نقل کرنے لکھنے کی نہیں دی جن میں اکثر لوگوں کی خرابی کا اندیشہ تھا، آپ نے صاف ممانعت فرمادی، اس سے معلوم ہوا کہ جس امر میں عام فتنہ ہو، اس کی خواص کو بھی اجازت نہیں دی جاتی بشرطیکہ وہ امر دین میں ضروری نہ ہو، اس لئے یہ شبہ بالکل غلط ہے کہ تقلید شخصی کا وجوب سب کے حق میں کیوں ہے اور خواص کو بھی تقلید شخصی کا ترک کیوں جائز نہیں، اس شبہ کا ساقط ہونا بخوبی معلوم ہوگیا۔

انحصار تقلید در مذاہب اربعہ

اگر کوئی یہ کہے کہ اگر تقلید ضروری ہے تو مجتہدین بہت ہوئے ہیں کسی کی بھی تقلید ہو جائے کافی ہے، پھر مذاہب اربعہ ہی کی کیا تخصیص ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تقلید شخصی کے وجوب کے بیان سے یہ

بات بھی معلوم ہو چکی کہ مختلف اقوال پر عمل اختیار کرنا متضمن مفاسد ہے، لہٰذا ضروری ہے کہ ایسے شخص کی تقلید کی جاوے جس کا مذہب اصولاً و فروعاً ایسا مدون و منضبط ہو کہ قریب قریب سب سوالات کا جواب اس میں جزئیاً یا کلیاً مل سکے تاکہ دوسرے اقوال کی طرف رجوع نہ کرنا پڑے، اور یہ امر منجانب اللہ ہے کہ یہ صفت بجز مذاہب اربعہ کسی مجتہد کے مذہب کو حاصل نہیں، اس لئے ضروری ہوا کہ ان ہی میں سے کسی مذہب کو اختیار کیا جاوے، اسی بناء پر زمان مدید سے اکثر جمہور علماء امت کا یہی تعامل اور توارث چلا آرہا ہے، حتیٰ کہ بعض علماء نے ان مذاہب اربعہ میں اہل سنت والجماعت کے منحصر ہونے پر اجماع نقل کیا ہے۔

مذہب حنفی کیوں اختیار کیا جائے

اب یہ سوال باقی رہا کہ آپ حضرات نے ان مذاہب اربعہ میں سے مذہب حنفی کیوں اختیار کیا جب کہ دوسرے مذاہب بھی حق اور صحیح ہیں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ ہم ایسے مقام پر ہیں جہاں پہلے سے ہی بلا ہمارے اختیار و اکتساب کے حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب شائع ہے، اور اسی مذہب کے علماء اور کتابیں موجود ہیں

تو اگر ہم اب دوسرے مذہب کو اختیار کرتے تو واقعات کے احکام کا معلوم ہونا مشکل ہوتا ۔ رہا یہ کہ پھر جہاں سب مذاہب شائع ہیں وہاں تو یہ کلفت نہیں، لہٰذا وہاں جا کر حنفی کیوں بنے رہتے ہو؟

اس کا جواب یہ ہے کہ چونکہ پہلے سے بوجہ ضرورت مذکورہ حنفی مذہب پر عمل کر رہے ہیں، اب دوسرے مذہب کو اختیار کرنے میں اسی تقلید شخصی کا ترک کرنا لازم آتا ہے جس کی خرابیاں بیان ہو چکیں ۔

نیز یہ کہ جس شخص کو قوت اجتہادیہ نہ ہو وہ ترجیح کے وجوہ نہیں سمجھ سکتا، پس دوسرے مذہب کو اختیار کرنا ایسے مقام پر پہنچ کر ترجیح بلا مرجح ہوگا جو کہ جائز نہیں ۔

علاوہ ازیں اگر کوئی وجوہ ترجیح تھوڑی بہت سمجھ بھی سکتا ہو تو اس کے اس ارتکاب یعنی مذہب سابق کو ترک کر کے دوسرے کو اختیار کرنے سے عوام الناس کے لئے ترک تقلید شخصی کا باب مفتوح ہوگا اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ جو امر عوام کے لئے باعث فتنہ و فساد ہو، اس سے خواص کو بھی رکنا اور رکنا ضروری ہوتا ہے، اسی لئے انتقال عن المذہب ممنوع ہے ۔

جو شخص آج ہی اسلام قبول کرے

اگر یہ کہا جاوے کہ جو شخص آج ہی اسلام قبول کرے

یا عدم تقلید کی روش چھوڑ کر تقلید اختیار کرے تو اس کے لئے کیا حکم ہے کیا وہ مذہب حنفی ہی اختیار کرے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وہ شخص ایسی جگہ ہے کہ جہاں مذہب حنفی شائع ہے تب تو اس کے لئے یہی امر مرجح ہے کہ وہ مذہب حنفی اختیار کرے جیساکہ ہم بیان کر چکے، اور اگر وہ ایسے مقام پر ہے کہ جہاں چند مذاہب شائع ہیں تو اس کے لئے لازم نہیں کہ مذہب حنفی اختیار کرے بلکہ وہ علی التساوی مختار ہے جس مذہب کو اس کا قلب قبول کرے اس کو اختیار کرے، مگر پھر بس اسی کا پابند رہے۔

البتہ اگر کسی ایک معین مذہب کا مقلد ایسی جگہ پہنچے جہاں اس مذہب کا کوئی عالم نہ ہو، اور یہ شخص خود بھی عالم نہ ہو، اور اس کو کوئی مسئلہ پیش آوے تو چونکہ اس کو یہاں اپنے مذہب پر عمل ممکن نہیں ہے ادھر دوسرے مذہب پر عمل کرنے میں کوئی خرابی نہیں تو ایسے شخص کو جائز بلکہ واجب ہے کہ مذاہب اربعہ میں سے جو مذہب وہاں شائع ہو علماء سے دریافت کرے ایسے شخص کیلئے بعذر مذکور مذہب سابق کی تقلید شخصی کو واجب نہ کہا جائیگا لیکن ایسی صورت شاذونادر ہی واقع ہوگی، پس اکثر حالات میں تو تقلید شخصی ہی کا حکم مضبوط اور محفوظ ہے، لہٰذا عمومی حکم تقلید شخصی کے وجوب ہی کا ہوگا۔

تعریف اجتہاد

قوت اجتہاد وہ ایک ملکہ خاصہ قوت وہبیہ فہمیہ علمیہ ہے جس کے استعمال کی وساطت سے اس قوت کے اہل، نصوص کے مدلولات خفیہ و معانی دقیقہ اور احکام کے اسرار و علل یعنی احکام تکلیفیہ و احکام وضعیہ پر مطلع ہو کر اس پر مطمئن ہو جاتے ہیں گو دوسرے وقت یہی اطمینان دوسری شق میں ہو جاوے، اس وقت پہلی شق سے رجوع کر لیتے ہیں، اسی کو محققین نے اختیار کیا ہے اور کہا ہے المجتہد یخطی ویصیب۔

یہی وہ قوت ہے جس کو فہم، فقہ، علم، اجتہاد، استنباط، شرح صدر وغیرہ عنوانات سے آیات و احادیث میں جا بجا تعبیر کیا گیا ہے

تنبیہ :- اجتہاد کے اس معنی اور حقیقت سے معلوم ہوا کہ مجتہد وہ ہے جس میں یہ قوت ذوقی وہبی موجود ہو کیونکہ اجتہاد کی تعریف اور اس کی ماہیت بتلاتی ہے کہ نصوص کے بعض معانی ظاہر ہیں اور بعض مدلولات و معانی خفی و دقیق ہیں، جو کہ وہ اسرار و علل و حکم

ہیں، چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرآن سات حرفوں پر نازل کیا گیا ہے، اور ہر آیت کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن، اور ہر حد کے لئے طریق اطلاع جداگانہ ہے، یعنی مدلول ظاہری کے لئے علوم عربیہ اور مدلول خفی کے لئے قوت فہمیہ وہبیہ۔

اس سے ثابت ہوا کہ نصوص کے سمجھنے میں اشخاص کے افہام متفاوت ہیں، کوئی ظاہر نص تک ہی رسائی رکھتا ہے، کوئی بطن نص تک پہنچ جاتا ہے۔

نیز معلوم ہوا کہ اس تفاوت افہام میں ہر درجہ موجب شرف و فضل نہیں، بلکہ کوئی خاص درجہ فہم ہے جو اپنے دقیق وعمیق ہونے کے سبب موجب فضل وشرف ہے۔ اور اس درجہ میں اس کو علم معتد بہ سمجھا جاتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ درجہ خاص فہم کا مکتسب نہیں محض ایک وہبی اور عطاء الٰہی ہے کہ جس کو عطا ہوتا ہے اس کے لئے رافع تردد اور مورث طمانینتِ قلب ہو جاتا ہے۔

چنانچہ بخاری وترمذی میں روایت ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ زمانہ جنگ اہل یمامہ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میرے بلانے کو آدمی بھیجا، میں وہاں

پہنچا، کیا دیکھتا ہوں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی بیٹھے ہیں، حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ (حضرت) عمرؓ نے صلاح دی ہے کہ واقعہ یمامہ میں بہت سے قرآء شہید ہوگئے، لہٰذا مجھ کو اندیشہ ہے کہ اگر اسی طرح یہ کام آتے رہے تو قرآن کا بڑا حصہ ضائع ہوجائے گا، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ آپ قرآن جمع کرنے کا حکم فرمائیں، میں نے (حضرت) عمر کو جواب دیا کہ جو کام رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے نہیں کیا اس کو میں کس طرح کروں، حضرت عمرؓ نے کہا واللہ یہ کام خیر محض ہے پس برابر بار بار اسی کو کہتے رہے حتیٰ کہ مجھ کو بھی شرح صدر ہوگیا۔

تو دیکھئے کہ اول حضرت ابوبکرؓ کو بوجہ ظاہر احادیث ذم بدعت، اس کے خیر ہونے میں تردد ہوا، مگر جب ان کے قلب پر مدلول خفی وسر حکم اجتناب عن البدعۃ القا ہوا، تو اس کا حفظ دین ماموربہ کے حکم کلی میں داخل ہونا منکشف ہوکر اس کے خارج عن البدعۃ ہونے میں اطمینان حاصل ہوگیا۔

اسی فہم خاص اور ذوق وہبی کے بارے میں وہ حدیث ہے جس کو بخاری وترمذی وغیرہ میں روایت کیا ہے کہ ابوجحیفہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے پوچھا کہ کیا آپ کے پاس کچھ ایسے علوم و مضامین لکھے ہوئے ہیں جو کتاب اللہ میں نہیں ہیں، انھوں نے فرمایا

قسم اس ذات کی جس نے دانہ کو پھاڑ کر نکالا اور جان کو پیدا کیا ہمارے پاس کوئی ایسا علم نہیں، لیکن ایک فہم خاص ضرور ہے جس کو قرآن میں اللہ تعالیٰ کسی کو عطا فرماتے ہیں۔

حدیث نبوی میں ارشاد ہے کہ تر و تازہ فرمائیں اللہ تعالیٰ اس بندہ کو جو میری حدیث کو سنے اور اس کو یاد کرے اور یاد رکھے اور دوسرے کو پہنچا دے کیونکہ بعضے پہنچانے والے علم کے خود فہیم نہیں ہوتے اور بعضے ایسوں کو پہنچاتے ہیں جو اس پہنچانے والے سے زیادہ فہیم ہوتے ہیں (رواہ ابوداؤد والترمذی وغیرہما)۔

اس حدیث سے صراحۃً اور صاف ثابت ہے کہ بعضے محدث حافظ حدیث صاحب فہم نہیں ہوتے یا قلیل الفہم ہوتے ہیں۔

چنانچہ موطا امام مالک میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ ابن عمرو بن العاص سے مسئلہ پوچھا کہ کسی شخص نے اپنی بیوی کو قبل صحبت تین طلاق دیدیں، کیا فتویٰ ہے، حضرت عطاء رحمہ اللہ موجود تھے، انھوں نے جواب دیا کہ باکرہ کو ایک ہی طلاق پڑتی ہے حضرت عبداللہ نے فرمایا کہ تم تو محض واعظ ہو، ایک طلاق سے تو بائن ہو جاتی ہے اور تین طلاق سے حلالہ کرنے تک حرام ہو جاتی ہے، غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت عطاء رحمہ اللہ تعالیٰ کے فتوے کو

باوجود ان کے بڑے محدّث و عالم ہونے کے حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص نے محض قوت اجتہادیہ کی کمی کی وجہ سے معتبر و معتدبہ نہیں سمجھا اور انما انت قاص فرما کر ان کے مجتہد نہ ہونے کی طرف اشارہ فرما دیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ نقل روایات اور بات ہے اور افتاء و اجتہاد اور بات ہے۔

پس جس شخص کو قوت اجتہاد حاصل نہ ہو اس کو اجتہاد کرنے کی اجازت نہیں، تو ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص حافظ حدیث ہو مگر مجتہد نہ ہو، اس لئے صرف جمع روایات اور حافظ حدیث ہونے سے اس کا قابل تقلید ہونا ضروری نہیں، ابوداؤد میں روایت ہے کہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ مبارک میں ایک شخص کے زخم ہو گیا پھر احتلام ہو گیا، ساتھیوں نے اس کو غسل کے لئے حکم دیا، اس نے غسل کیا اور مر گیا، یہ خبر رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو پہنچی، آپ نے ارشاد فرمایا لوگوں نے اس کو قتل کیا، اللہ تعالیٰ ان کو قتل کریں، کیا نہ جاننے کا علاج، ناواقف ہونے کا علاج پوچھنا نہیں ہے پوچھ لیتے، اس کو تو اس قدر کافی تھا کہ تیمم کر لیتا، اور اپنے زخم پر پٹی باندھ لیتا، پھر اس پر مسح کر لیتا اور باقی بدن دھو لیتا۔

دیکھئے یہاں ہمراہیوں نے اپنی رائے سے آیت وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا کو معذور وغیر معذور دونوں کے حق میں اور آیت وَاِنْ كُنْتُمْ مَّرْضٰى کو حدثِ اصغر کے ساتھ خاص سمجھ کر یہ فتویٰ دیا تھا، مگر آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے اس فتویٰ پر ردو انکار فرما دیا اور یہ اس وجہ سے کہ فتویٰ دینے والے اجتہاد کی صلاحیت وقوت نہ رکھتے تھے اس لئے ان کا قیاس سے فتوی دینا جائز نہیں رکھا، کیونکہ مجتہد کو تو بوجہ صلاحیت وقوت اجتہاد ہونے کے اجتہاد وقیاس سے فتوی دینا خود حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم نے جائز رکھا ہے اور اجتہاد وقیاس کو حجۃ شرعیہ فرمایا ہے۔

چنانچہ ابوداؤد میں ہے کہ حضرت عمرو بن العاصؓ فرماتے ہیں کہ مجھ کو غزوہ ذات السلاسل کے سفر میں ایک سردی کی رات میں احتلام ہوگیا اور مجھ کو اندیشہ ہوا کہ غسل کروں گا تو شاید ہلاک ہو جاؤں گا، میں نے تیمم کر کے اپنے ہمراہیوں کو صبح کی نماز پڑھا دی، ان لوگوں نے جناب رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے حضور میں عرض کیا تو فرمایا اے عمرو تم نے حالت جنابت میں لوگوں کو نماز پڑھا دی، میں نے اپنا وہ عذر بیان کیا اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَنْفُسَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ہ کہ اپنی جانوں کو قتل مت کرو،

بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سن کر ہنس پڑے اور کچھ نہ فرمایا۔

اس سے صراحۃً اجتہاد اور قیاس دونوں کے جواز پر دلالت ہو رہی ہے کہ آپ ﷺ کے سوال پر عمرو بن العاص ؓ نے وجہ استدلال کو بیان کیا اور آپ ﷺ نے اس کو جائز رکھا، اور یہ اس وجہ سے کہ ان میں شان اجتہاد اور صلاحیت قیاس موجود تھی، لہٰذا ان کے فتویٰ کو جائز رکھا،

اسی طرح نسائی شریف میں ہے کہ دو شخصوں نے تیمم کر کے نماز پڑھی پھر وقت کے رہتے ہوئے پانی مل گیا تو ان میں سے ایک نے تو وضو کر کے نماز لوٹالی، دوسرے نے نہیں لوٹائی، پھر دونوں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے واقعہ بیان کر کے سوال کیا جس شخص نے نماز کا اعادہ نہیں کیا اس سے آپ نے ارشاد فرمایا أَصَبْتَ السُّنَّةَ کہ تم نے طریق سنت کے موافق کیا اور وہ پہلی نماز تم کو کافی ہوگئی، اور دوسرے شخص سے فرمایا کہ تم کو پورا حصہ ثواب کا ملا، یعنی دونوں نمازوں کا ثواب ملا،

ظاہر ہے کہ ان دونوں صحابیوں نے اس واقعہ میں اجتہاد و قیاس پر ہی عمل کیا تھا اور آپ ﷺ نے کسی پر ملامت نہیں فرمائی البتہ ایک کا قیاس صحیح سنت کے موافق نکلا اور دوسرے کا غیر صحیح

اس لئے محققین کے نزدیک یہ مسئلہ مسلم ہے کہ اَلْمُجْتَهِدُ يُخْطِىْ وَ يُصِيْبُ مجتہد سے خطا بھی ہو جاتی ہے اور صواب و درست بھی، چنانچہ اس حدیث میں باوجود ایک قیاس صحیح ایک غیر صحیح کے یہ نہیں فرمایا کہ تم نے قیاس پر عمل کیوں کیا، پس قیاس کا جواز صاف ثابت ہو گیا، ان سب احادیث سے معلوم ہوا کہ نص صریح نہ ملنے پر صحابہ کرام باذن رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اجتہاد کرتے تھے۔

جیسے یہاں بعض صحابہ کے اجتہاد کے چند جزئیات پیش کئے گئے اسی طرح دوسرے مجتہدین صحابہ کے اجتہادات کا ذکر بھی احادیث میں منثور ہے۔

لیکن پورے طور پر حضرات صحابہ میں سے کسی کا مذہب منضبط اور مدون نہیں، اور تقلید کے لئے ضروری ہے کہ مذہب اصولاً و فروعاً مکمل اور پورے طور سے مدون ہو جیسا کہ پہلے ثابت کیا گیا۔

اور یہ بات ائمہ اربعہ مجتہدین مشہورین کے سوا اور کسی مجتہد کے مذہب کو حاصل نہیں ہے، اس لئے براہ راست کسی ایک صحابی کی تقلید کلی سے معذوری ظاہر ہے، البتہ ائمہ اربعہ کے مذاہب کے ضمن میں حضرات صحابہ کا بھی اتباع و تقلید ہو رہی ہے، یہ تقلید یعنی بلا سوال دلیل، مجتہد کی بات ماننا حکم غیر منصوص، محتمل وجوہ مختلفہ میں غیر مجتہد

کے لئے واجب ہے، اور مجتہد کے لئے دوسرے مجتہد کی تقلید جائز نہیں۔

پھر ائمہ اربعہ مجتہدین متبوعین جن کی تقلید کی جاتی ہے ان کا ہادی و مہتدی، متورع و متقی، صحیح الفہم عالم و عامل ہونا، صحیح الذوق والاجتہاد ہونا تواتر سے ثابت ہے، اور اس پر بھی اجماع ہے کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد ختم ہوگیا، اس لئے اب ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک ہی کی تقلید واجب ہے، جیساکہ مدلل طور پر بیان ہو چکا۔

یہ تھا بیان تعریف اجتہاد اور اس کے حدود اور مجتہدین کی علوشان کا۔

اب قیاس صحیح اور رائے فاسد کا بیان یا یوں کہنا چاہیئے کہ قیاس معقول و مقبول اور اس کے خلاف قیاس غیر معقول و غیر مقبول کا فرق ذکر کیا جاتا ہے۔

قیاس اور رائے کا فرق

قیاس دلیل شرعی کی طرف مستند ہوتا ہے، اور رائے سے وہ رائے مراد ہے جو کہ دلیل شرعی کی طرف مستند نہ ہو، محض تخمین عقلی ہو۔

چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں لو کان الدین بالرأی لکان اسفل الخف اولی بالمسح من اعلاہ ولکن رأیت رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم یمسح اعلاہ (رواہ ابوداؤد)

کہ اگر دین کا مدار رائے پر ہوتا تو موزوں کے نیچے کی جانب بہ نسبت اوپر کی جانب کے مسح کی زیادہ مستحق تھی، لیکن میں نے رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو اوپر کی جانب مسح کرتے دیکھا ہے، اس لئے میں اوپر کی جانب مسح کرتا ہوں۔

اسی طرح حضرت امام ابو حنیفہؒ سے منقول ہے، امام صاحب حضرت امام باقرؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو امام باقرؒ نے فرمایا کہ تم قیاس کی بناء پر ہمارے دادا کی حدیثوں کی مخالفت کرتے ہو۔

امام صاحبؒ نے نہایت ادب سے عرض کیا عیاذاً باللہ حدیث کی مخالفت کون کرسکتا ہے، آپ تشریف رکھیں تو عرض کروں، پھر حسب ذیل گفتگو ہوئی۔

امام صاحبؒ نے عرض کیا مرد ضعیف ہے یا عورت، امام باقرؒ نے فرمایا عورت۔ امام صاحبؒ نے فرمایا کہ وراثت میں مرد کا حصہ زیادہ ہے یا عورت کا، امام باقرؒ نے فرمایا مرد کا، اس پر امام صاحبؒ نے فرمایا کہ اگر میں قیاس لگاتا تو کہتا کہ عورت کو زیادہ حصہ دیا جائے کیونکہ ضعیف کو ظاہر قیاس کی بناء پر زیادہ ملنا چاہیئے، پھر آپ نے کہا نماز افضل ہے یا روزہ، امام باقرؒ نے فرمایا نماز، امام صاحبؒ نے فرمایا اس اعتبار سے حائضہ پر نماز کی قضا لازم ہونی چاہیئے نہ روزہ کی حالانکہ میں روزہ ہی کی قضا کا فتویٰ دیتا ہوں، یہ جوابات سن کر امام باقرؒ اس قدر خوش ہوئے کہ آپ کی پیشانی چوم لی۔

اسی لئے ابلیس کا قیاس جو کہ رائے محض، بلا مستند دلیل شرعی تھا مردود قرار پایا، چونکہ اس نے بمقابلہ نص قیاس کیا جو کہ رائے محض کہلاتا ہے۔

بخلاف قیاس مجتہدین کے کہ وہ توضیح معانی نصوص کے لئے ہوتا ہے، اسی لئے کہا جاتا ہے القیاس مظہر لا مثبت کہ قیاس شرعی

مظہر احکام ہے نہ کہ مثبت احکام۔

لہٰذا قیاس شرعی پر عمل کرنا اللہ و رسول کی مخالفت نہیں بلکہ عین رجوع الی اللہ والی الرسول (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) ہے۔

پس جہاں نص قطعی الدلالت ہے وہاں ہم بھی اجتہاد کو جائز نہیں کہتے، اور جہاں نصوص متعارض ہیں یا متعارض تو نہیں مگر وجوہ مختلفہ و معانی متعددہ کو محتمل ہوں اور کوئی معنی قریب کوئی بعید معلوم ہوں وہاں اجتہاد و تقلید کی ضرورت ہوگی۔

قسم اول میں رفع تعارض کیلئے مجتہد کو اجتہاد کی اور غیر مجتہد کو تقلید کی ضرورت ہوگی، اور قسم ثانی میں ظنی الدلالت ہونے کے سبب چند احتمالات میں سے کسی ایک کی تعیین کے لئے اجتہاد و تقلید کی حاجت و ضرورت ہوگی۔

ایک شبہ اور اس کا حل

اگر یہ شبہ و سوال کیا جاوے کہ نبوت تو ختم ہوگئی یہ تو ثابت بالقطعیۃ و حکم قرآنی ہے، لیکن اجتہاد کا ختم ہونا کیسا؟ (تسلیم نہیں) چونکہ اس کی کوئی قطعی دلیل نہیں، لہٰذا ہم بھی اجتہاد کر سکتے ہیں، اور جب ہم بھی اجتہاد کر سکتے ہیں تو ہم بھی مجتہد ہیں اور مجتہد کو سب کے نزدیک مسلم ہے کہ دوسرے مجتہد کی تقلید جائز نہیں۔

اس شبہ کا حل اور سوال کا جواب یہ ہے کہ ذرا تامل اور حق شناسی کے ساتھ نظر فرمائی جاوے تو یہ دعویٰ محض دعویٰ ہے یعنی بلا دلیل ہے بلکہ خلاف دلیل نظر آجائیگا، کیونکہ ہم نے مانا کہ قوت اجتہادیہ کا پایا جانا گو عقلاً یا شرعاً محال و ممتنع تو نہیں، لیکن مدت اور عرصہ دراز سے یہ قوت مفقود ہے۔

(۱) دلیل اس کی یہ ہے کہ کیف ما اتفق مختلف ابواب کے چند سوالات فرعیہ جو قرآن و حدیث میں منصوص نہ ہوں وہ لئے جائیں اور کوئی صاحب علم اپنے اجتہاد مزعوم سے ان کے جوابات قرآن و حدیث سے مستنبط کریں اور جن اصول پر استنباط کریں ان کو بھی قرآن و حدیث کی عبارت سے یا اشارت سے یا دلالت سے بدلیل عقلی شافی ثابت کریں، جب یہ جوابات مکمل ہوجاویں پھر فقہاء مجتہدین کے جوابات اور ان کے ادلہ سے موازنہ کر کے بتقویٰ و بخوف خدا انصاف کریں تو اس وقت اپنے فہم و ادراک کا ضعف اور ان کے فہم و بصیرت کی قدر و منزلت انشاء اللہ تعالیٰ ایسی واضح ہوجائیگی کہ پھر اجتہاد کا دعویٰ بنظر انصاف زبان پر نہ آئے گا۔

چنانچہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنا ایک واقعہ لکھا ہے کہ سفر میں ایک ایسی ہی صاحب سے میری ملاقات

ہوئی جو مدعی اجتہاد تھے، میں نے ان سے سوال کیا کہ اچھا بتلائیے دو شخص سفر میں ہیں، ایک کو غسل جنابت کی حاجت ہے اور دوسرا بے وضو ہے، پانی موجود نہیں ہے دونوں نے تیمم کیا جنبی نے غسل کا اور بے وضو نے وضو کا ان میں سے کون امامت کے لئے بہتر ہے وہ صاحب فوراً بولے کہ جس نے حدث اصغر (وضو) کا تیمم کیا ہے وہ افضل ہے، اس لئے کہ اس کی نجاست خفیف (ہلکی) ہے، میں نے جواب دیا کہ یہ تو آپ کا اجتہاد ہے، اب فقہاء کرام کا اجتہاد سنئے وہ فرماتے ہیں جس نے جنابت کا تیمم کیا ہے وہ امامت کیلئے اولیٰ ہے، کیونکہ تیمم طہارت کاملہ ہے تو جس نے غسل کا تیمم کیا ہے وہ مثل غسل کرنیوالے کے ہے اور جس نے وضو کا تیمم کیا ہے وہ مثل وضو کرنیوالے کے ہے اور مغتسل متوضی سے امامت میں اولیٰ ہے، پس یہاں بھی متیمم غسل اولیٰ ہوگا، یہ تقریر سن کر وہ صاحب خاموش ہوگئے۔

(۲) اسی لئے محققین و مبصرین کو بعد تحقیق و کاوٗ کاوش، مشاہد و محقق ہوگیا کہ چوتھی صدی کے بعد یہ قوت مفقود ہوگئی، اس کی نظیر یہ ہے کہ محدثین سابقین کو جس درجہ کا حافظہ اللہ تعالیٰ نے عطاء فرمایا تھا وہ اب نہیں ہے، لہٰذا جیسے یہ قوت حافظہ کوئی نبوت نہیں تھی مگر ختم ہوگئی، اور اگر بالفرض کسی میں یہ قوت مذکورہ مان بھی لی جاوے تب بھی اجتہاد کی اجازت

دینے میں بیباک لوگوں کو جرأت دلانا ہے کہ دین میں جو چاہیں گے کہدیا کریں گے جیساکہ بعض کچھ پڑھے لکھے صاحبوں میں مشاہدہ بھی ہے کہ دین میں دخیل ہوتے ہیں، چنانچہ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ قریب ہی زمانہ کے ایک بدعتی اجتہاد رفقاء کیساتھ سفر میں تھے، نماز کا وقت آگیا تو آپ نے اپنی عقل سے تیمم کرنا شروع کیا کہ اول گٹوں تک دونوں ہاتھوں کو مٹی ملی، پھر منھ میں کلی کیلئے مٹی دینے لگے، ایک صاحب عالم ان کو دیکھ رہے تھے، انھوں نے کہا یہ طریقہ تیمم کا نہیں ہے پھر انھوں نے طریقہ بتلایا، خیر وہ مان گئے ورنہ مٹی پھانکنا اور سڑکنا پڑتی۔

پس ہر طرح یہ بات ثابت ہوگئی کہ اجتہاد و قیاس بزمانہ رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم جاری و ساری تھا اور یہ کام قوت اجتہاد و صلاحیت قیاس والوں کا تھا۔

ان دلائل و واقعات مذکورہ کے علاوہ قرآن پاک میں بھی ارشاد ہے جو آگے آرہا ہے، جس میں صاف ذکر ہے کہ یہ کام ہر ایک صحابی کا نہیں، اور جب صحابہ میں سے ہر ایک کا یہ کام نہ تھا، اور ہر ایک کو اس کی اجازت نہ تھی، حالانکہ وہ اہل زبان عربی اللسان تھے اور صاحب تقویٰ و ورع بھی تھے، تو بعد والوں کو اور خصوص ان کو جنہیں عربیت پر دسترس نہیں گو کچھ فن ادب عربی سے واقفیت ہو کیونکہ فن ادب سے تو اہل عرب اصحاب لسان خوب واقف تھے،

پھر بھی ان میں ہر ایک کو استنباط کی اجازت نہ تھی جو کہ وہ یہی اجتہاد ہے، تو ہمارے زمانہ میں بطریقِ اولیٰ اس کی اجازت نہ ہوگی اور کیوں کر ہو سکتی ہے جب کہ اس زمانہ میں حریت و خود رائی، من مانی اور خواہشات و ہوائے نفس کا بھی غلبہ ہے۔

(۳) اس استنباط و اجتہاد کے لئے ایک مخصوص جماعت ہے جو صاحب ذوق، متورع، صاحب عقل مستقیم، صاحب نورِ علم وہبی ہوتی ہے، اس تخصیص اور نفی تعمیم استنباط کے سلسلہ میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاِذَا جَآءَهُمْ اَمْرٌ مِّنَ الْاَمْنِ اَوِ الْخَوْفِ اَذَاعُوْا بِهٖ وَلَوْ رَدُّوْهُ اِلَى الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓى اُولِى الْاَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِيْنَ يَسْتَنْۢبِطُوْنَهٗ مِنْهُمْ ــــــــــ یہاں سے معلوم ہوا کہ قوت استنباط ہر ایک میں نہیں ہوتی، اس آیت کریمہ میں صحابہ کرام کو خطاب کیا گیا ہے، تو پھر صحابہ کرام کے علاوہ دوسرے لوگ تو بدرجہ اولیٰ اس کے مخاطب ہوں گے۔

ہر کام کیلئے قابلیت شرط ہے

(۴) اور یہ حکم اس لئے ہے چونکہ یہ امر مسلم ہے کہ ہر کام ایک مخصوص قابلیت کو چاہتا ہے، بلا اس قابلیت کو حاصل کئے ہوئے اگر اس کام کو انجام دیا جائیگا تو کام بننے کے بجائے

بگڑ جائے گا۔

مادّیات میں تو اس بگاڑ کو ہر شخص دیکھ سکتا ہے، مثلاً کوئی شخص آٹا بھی گوندھنا نہ جانتا ہو، اور وہ روٹی پکانے کا شوق کرے تو ظاہر ہے روٹی بجائے پکنے کے بگڑ جائے گی، اور اس بگاڑ کو ہر شخص اپنی آنکھوں سے دیکھ سکے گا، چونکہ یہ مادّیات کا بگاڑ ہے۔

بخلاف اس کے غیر مادی اشیاء کا بگاڑ چونکہ محسوس ومشاہد نہیں ہوتا، لہٰذا اس کا بگاڑ ہر شخص نہیں جان سکتا، صاحب علم ہی اس بگاڑ کو سمجھ سکتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک ایسا شخص جو ان صفات سے عاری اور ان علوم سے ناآشنا ہو جو اجتہاد کے لئے شرط ہیں، مگر اس کے باوجود یہ شخص محض اپنے ذہنی مطالعے کی بنیاد پر بلا کسی معلم واستاذ خود بخود مجتہد العصر بن بیٹھے تو اس کے کارِ اجتہاد میں ضرور خرابیاں ہوں گی، مگر انھیں کوئی صاحب علم ہی جان سکتا ہے۔ ہر شخص ان غلطیوں اور خرابیوں کا احساس نہیں کر سکتا۔

جب یہ بات ذہن نشین ہو گئی کہ ہر کام کے ٹھیک ٹھیک انجام دینے کے لئے سب سے پہلے اس کام کے کرنے والے کے اندر اس کام کی صحیح صحیح انجام دہی کی قابلیت ضروری ہے تو اسی پر اجتہاد

کو بھی قیاس کر لیجیے، اب دیکھنا یہ ہے کہ اس تقویٰ (خشیت کیساتھ ساتھ اجتہاد کے لئے کیا شرائط ہیں، اور کون کون سے علوم میں مہارت تامہ اجتہاد کے لئے ضروری ہے، اس سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ "الانصاف" میں تحریر فرماتے ہیں -

وھو ان یعرف من القرآن والسنۃ ما یتعلق بالاحکام و خاصہ و عامہ و مجملہ و مبینہ و ناسخہ و منسوخہ و متواتر السنۃ وغیرھا والمتصل والمرسل وحال الرواۃ قوۃً وضعفًا و لسان العرب لغۃً ونحوًا واقوال العلماء من الصحابۃ ومن بعدھم اجماعًا واختلافًا والقیاس بانواعہ (الانصاف ص۷۱)

ترجمہ - مجتہد کے لئے ضروری ہے کہ قرآن و سنت کے متعلق بالاحکام تمام علوم کی پوری معرفت حاصل ہو، خاص و عام، مجمل و مبین ناسخ و منسوخ کو جانے، اسی طرح حدیث میں متواتر غیر متواتر، متصل مرسل وغیرہ تمام اقسام حدیث کو اور راویوں کی قوت اور ضعف کو جانتا ہو، عربی زبان کو لغت و نحو پر پوری مہارت کے ساتھ جانتا ہو، اقوال علماء صحابہ و تابعین اور ان کے اجماع اور اختلاف کو جانتا ہو، نیز قیاس کی تمام قسموں کو جانتا ہو، (ترجمہ ختم شد)

ان اوصاف و شرائط اجتہاد سے عاری ہوتے ہوئے شوق اجتہاد

کرنا مذکورۃ الصدر امر مسلم کے مطابق بڑا ظلم و ناانصافی ہوگی۔

چنانچہ جو حضرات اس زمانے میں ان شرائط اجتہاد کے نہ پائے جانے کے باوجود اپنی ہوائے نفسانی و آزادی طبع کی بناء پر اجتہاد کرتے ہیں تو کہیں جمع بین الاختین کو جائز قرار دیتے ہیں، کہیں پانی کے موجود ہوئے وضو کو ساقط کر دیتے ہیں وغیر ذٰلک۔ اس قسم کے نمونے ان کے اجتہادِ فاسد کے سامنے آتے ہیں۔

دنیوی علوم کی مثال

(۵) غضب ہے آج دنیوی قانون کے اندر تو جو ہمارے ہی جیسے انسان کا بنایا ہوا ہے یہ ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اس کے سلسلہ میں قابلِ تسلیم رائے زنی سے قبل اس قانون کا علم مستند طریقہ پر حاصل کیا جائے اور جب کسی شخص کو علم قانون میں قابلیت کی پوری طرح باضابطہ سند مل جائے تب وہ شخص قانون کی عدالت میں وکیل یا منصف بن سکتا ہے۔

بلا اس کے خواہ اس نے اپنے مطالعہ سے کتنا ہی قانون پڑھا ہو کتنا ہی ذہین ہو، کسی عدالت میں وکالت نہیں کر سکتا نہ اس کی رائے قابل تسلیم ہو سکتی ہے، مگر خدا کا قانون جو انسانوں کا بنایا ہوا نہیں ہے، کتنی ہی غامض حکمتیں اس کے اندر مخفی ہیں اس کیلئے

کوئی شرط نہ ہو ہر وہ شخص جو اپنے ذہنی مطالعے اور تحریر و تقریر کی مشق کی بنا پر کچھ لکھ پڑھ سکتا ہو دعوائے اجتہاد کر بیٹھے اور سادہ لوح انسان اس کی تقلید شروع کر دیں کتنا بڑا ظلم ہے۔

پھر اس قسم کے خام علم لوگوں کے اجتہادات کا جو حال ہوتا ہے وہ ہمارے سامنے ہے، چونکہ ان کی نظر ادلّہ شرعیہ پر نہیں ہوتی ادھر تقلید کو یہ حضرات ذہنی غلامی خیال کرتے ہیں، ایسی حالت میں جب یہ حضرات اجتہاد کرنے بیٹھتے ہیں تو ایسی فاحش غلطیاں کرتے ہیں جو خود ان کے دعوائے اجتہاد کے بطلان پر شاہد عدل ہوتی ہیں

جودتِ طبع، جدت فکر، ذہانت، فصاحت و بلاغت، انشاء پردازی وغیرہ خواہ انسان کے لئے فی نفسہ کیسے ہی کار آمد اوصاف ہوں مگر اس کا یہ مطلب تو ہرگز نہیں کہ جس شخص کے اندر یہ اوصاف ہوں وہ مجتہد بھی ہو سکتا ہے۔ ہر کمال کی ایک حد ہوتی ہے اور اسی اپنی حد کے اندر اس کمال کا استعمال ہونا چاہیئے، اس حد سے باہر وہ کمال بجائے کمال کے باعث زوال بن جاتا ہے۔

اہل علم کے اوصاف

(۶) اللہ تعالیٰ نے اہل علم کے اوصاف کے سلسلہ میں ارشاد فرمایا ہے

۱۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا۔

۲۔ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ۔

۳۔ فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔

۴۔ وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ۔

۵۔ وَقَالَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَیْلَکُمْ ثَوَابُ اللّٰہِ خَیْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ۔

حدیث شریف میں ہے۔

۱۔ فضل العلم خیر من فضل العبادۃ وملاك الدین الورع۔

۲۔ من عمل بما علم ورثہ اللّٰہ علم ما لم یعلم۔

۳۔ من یرد اللّٰہ بہ خیرا یفقھہ فی الدین

۴۔ خیر امتی علماءھا رحماءھا۔

۵۔ تعلموا العلم وعلموہ الناس وتعلموا لہ الوقار والسکینۃ

اقوال سلف

حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں لیس العلم بکثرۃ الروایۃ ولکن العلم نور یلقی فی القلب۔ حضرت امام وکیعؒ امام شافعیؒ کے لئے فرماتے ہیں۔

شَکَوْتُ اِلٰی وَکِیْعٍ سُوْءَ حِفْظِیْ ۔۔ فَاَوْصَانِیْ اِلٰی تَرْکِ الْمَعَاصِیْ

فَاِنَّ الْعِلْمَ نُوْرٌ مِّنْ اِلٰہٍ ۔۔ وَنُوْرُ اللّٰہِ لَا یُعْطٰی لِعَاصِیْ

حضرت حسن بصریؒ کا قول ہے العلم علمان علم فی القلب فذالك العلم النافع وعلم علی اللسان فذالك حجۃ اللہ علی ابن آدم۔

ان آیات و آحادیث نیز آثار واقوال سلف سے یہ امر بخوبی واضح ہوگیا کہ علم دو قسم پر ہے۔

ایک بلارعایت آداب علم وحصول اوصافِ اہل علم محض ظاہری الفاظ کو پڑھ لینا، یہ علم احکام خداوندی کے سمجھنے اور دوسرے کو سمجھانے کے لئے کافی نہیں ہے، جیساکہ ہمارے شائقین اجتہاد حضرات کو دھوکہ ہوا ہے۔

دوسرا علم علم حقیقی علم قلبی ہے جس کو علم ربانی اور علم وہبی سے بھی تعبیر کیا جاتا ہے، اس علم کے ساتھ صاحب علم کے اندر خدا کی خشیت، اس کا ذکر، راہ حق پر استقامت، رسوخ فی العلم، ورع و تقویٰ، علم پر عمل کرنے کی برکت سے منجانب اللہ علومِ وہبیہ کا فیضان امت پر شفقت، وقار و متانت، حلم و بردباری، استغنار و قناعت، نور اجتہاد و نور معرفت کے اوصاف پیدا ہوتے ہیں خوف خدا کیوجہ سے ان حضرات کو اظہارِ حق پر مخلوق کا خوف مانع نہیں ہوتا حلم کیوجہ سے مخلوق کے کسی بھی تشدد پر اشتعال نہیں ہوتا، استغنار کیوجہ سے

سخت سے سخت فقر و افلاس کی حالت میں بھی مخلوق کے سامنے تملق نہیں ہوتا۔

ان اوصاف کو مدنظر رکھتے ہوئے جب ان اربابِ صدق وصفا اصحاب ورع وتقویٰ کے حالات پر نظر کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے نور اجتہاد عطا فرمایا تھا تو بکمال وتمام ان اوصاف کو آپ ان اسلافِ کرام کی زندگیوں میں موجود پائیں گے، آپ کو ان کے پاکیزہ حالات میں ملے گا کہ ہمیشہ ان پر خدا کا خوف طاری رہا کبھی اپنے علم کے زعم کا ادنیٰ اظہار بھی ان کی زبانوں پر نہیں آیا۔

عبادت کا یہ حال ہے کہ چالیس سال تک عشار کی وضو سے فجر کی نماز پڑھ رہے ہیں، تقویٰ کا یہ عالم ہے کہ مقروض کی دیوار کے سایہ میں بیٹھنے سے بھی اجتناب فرما رہے ہیں، کہیں کسی مسئلہ حق کی سزا میں ان کی پیٹھ پر درّے لگائے جا رہے ہیں، کہیں جلاوطن کیا جا رہا ہے کہیں حکومتِ وقت کی جانب سے کسی عہدہ کی پیش کش کو قبول نہ کرنے کی سزا میں قید و بند میں مبتلا ہیں، مگر ان تمام حالات میں یہ اہل حق پوری استقامت کے ساتھ حق پر قائم ہیں، اور برابر اسی کا اعلان فرما رہے ہیں۔

شائقین اجتہاد سے گذارش

(۷) آجکل کے شائقین اجتہاد تجدد پسند حضرات سے ہماری گذارش ہے کہ آپ جس طرح تھوڑی سی سطحی معلومات کی بنا پر ان اسلاف کرام کی حرص کرتے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے علم کے ساتھ ساتھ اس کے اوصاف بھی عطا فرمائے تھے، کیا کبھی آپ نے ان کے اِن اوصاف زہد و تقویٰ، خشیت وانابت، احسان واخلاص عبادت واخلاق میں بھی ان حضرات کی اتباع کی حرص کی ہے۔

جبکہ قرآن وحدیث میں اہل علم کے مذکورہ اوصاف سے یہ بات بخوبی واضح ہے کہ وہ حضرات اہل علم جن کو اللہ تعالیٰ تفقہ فی الدین استنباط واجتہاد کا ملکہ عطا فرماتے ہیں، ان میں ان اوصاف کا ہونا ضروری ہے۔

آج ہمارا حال تو یہ ہے کہ نہ ہمارے اندر تقویٰ ہے نہ احکام الٰہی کی اتباع ہے، دین کو اپنی ہوائے نفسانی کے تابع کرنے کی فکر لگی ہوئی ہے اور جو لوگ اس پر فتن دور میں بلا خوفِ ملامت استقامت کے ساتھ دین پر قائم ہیں، ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔

ہماری علمی قابلیت کا یہ عالم ہے کہ براہ راست قرآن وحدیث سے اجتہاد کر کے ایک جدید فقہ مدون کرنا تو بڑی بات ہے ان فقہاء کرام

کے اصولِ اجتہاد اور ان اصول کے مطابق فروع کا جو استنباط فرمایا ہے، اس کے سمجھنے کی بھی ہمارے اندر اہلیت نہیں ہے۔

اس کے باوجود ان حضرات کی اجتہاد میں حرص کرنا سراسر جہالت و نادانی نہیں ہے تو اور کیا ہے۔ اگر آپ کو شوقِ اجتہاد ہے، تو اپنے اندر اوصافِ اجتہاد کا بھی ثبوت دیجئے۔ ؎

گر مجتہد ہیں آپ تو کچھ لائیے ثبوت
دعویٰ بلا دلیل تو مانا نہ جائے گا

مجتہد ہونے کا دھوکہ

(۸) دراصل ان حضرات کو اپنے ذاتی مطالعہ کی بنار پر کچھ معلومات حاصل ہو جانے کی وجہ سے اپنے مجتہد ہونے کا دھوکہ ہو گیا۔

حالانکہ بلا استاذ سے پڑھے ہوئے کچھ سیر و تاریخ کا مطالعہ کچھ کتب علوم دینیہ اور قرآن و حدیث پر سرسری نظر اجتہاد کے لئے قطعًا کافی نہیں ہے۔

اسی لئے فقہاء کرام نے یہ اصول مقرر فرمایا ہے کہ مفتی کے لئے بھی ماہر استاذ سے علم فقہ حاصل کرنا ضروری ہے، حالانکہ مفتی کا کام اجتہاد نہیں ہوتا نقل مذہب ہوتا ہے، علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں۔

لوان الرجل حفظ جميع كتب اصحابنا لابد ان يتلمذ للفتوى حتى يهتدى اليه (عقود رسم المفتی)

یعنی اگر کوئی شخص ہمارے ائمہ کرام کی تمام کتابیں حفظ کرلے پھر بھی فتویٰ دینے کے لئے کسی استاذ سے باقاعدہ علم حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ اس کو فتویٰ دینے کی صحیح قابلیت حاصل ہو سکے۔

فقدان صلاحیت اجتہاد کا عملی ثبوت

(۹) چونکہ واقعہ یہ ہے کہ ان جدت پسند حضرات کے اندر اجتہاد کی صلاحیت بالکل نہیں ہوتی، اس کے باوجود اس درجہ اجتہاد کی ضرورت پر شد و مد کیساتھ لکھنے کے، شائقانِ اجتہاد نے اپنے اجتہاد سے پورا جدید فقہ مدون کرنا تو درکنار اب تک صرف وضو کے مسائل بھی براہ راست قرآن و حدیث سے اجتہاد کرکے نہیں دکھلائے، جس سے معلوم ہوا کہ اجتہاد کی واقعی قابلیت یہ حضرات بھی اپنے اندر نہیں پاتے، ورنہ جب ان حضرات کو دعوائے اجتہاد ہے اور تقلید کو ذہنی غلامی قرار دیتے ہیں تو دوسروں کے لئے نہ سہی کم از کم اپنے عمل کی خاطر تو ان حضرات کو ضرور اجتہاد کرکے تمام ضروری عبادات و معاملات کے مسائل مدون کرلینا چاہئے تھا

سلف سے اختلاف

(۱۰) مگر کسی جدید فقہ کی تدوین کے بجائے عملاً دیکھا یہ گیا ہے کہ ان حضرات نے صرف چند مسائل میں سلف سے بے جا اختلاف ہی کو اپنا تجدیدی کارنامہ خیال کیا ہے۔

ان حضرات کے اجتہاد کا یہ عالم ہے کہ جہاں کہیں ان کے خیال میں کوئی ضرورت پیش آئی انھوں نے شریعت کے حکم کو بدل ڈالا گویا اصل چیز احکام نہیں، ان حضرات کی مفروضہ ضرورتیں ہیں، ان ضرورتوں کے مطابق جس طرح چاہیں دین کو ڈھال لیا کریں، اس طرز فکر کا بے دینی ہونا تو اپنی جگہ ایک امر مسلم ہے مگر ذرا یہ حضرات انصاف سے سوچیں کہ ایسی موم کی ناک جسے حسب ضرورت جس طرح چاہیں موڑ لیا کریں، کیا کوئی مذہب حق ہو سکتا ہے۔

اجتہاد فاسد کی ایک مثال

(۱۱) چنانچہ شائقین اجتہاد حضرات میں سے ایک صاحب نے حالات و ضروریات کے مطابق مسائل شرعیہ میں ترمیم و تبدیلی کی خاطر بقول ان کے زندہ اور صحت مند مثال کے طور پر اس واقعہ کو ذکر کیا ہے جو ایک دینی اجتماع کے موقع پر پیش آیا، لکھتے ہیں

اجتماع میں کثرتِ ازدحام کی وجہ سے لوگ فجر کی وضو کے لئے نلوں پر قطار لگائے ہوئے کھڑے تھے جب یہ بات صاف طور پر دکھائی دینے لگی کہ اگر لوگ پانی کے انتظار میں قطار لگائے کھڑے رہے تو سورج نکل آئے گا، اور ہزاروں آدمی وقت پر نماز ادا کرنے سے رہ جائیں گے، صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لئے جماعت کے علماء کی طرف سے لاؤڈ اسپیکر پر عام اعلان کیا گیا کہ جن لوگوں کو یہ امید نہ ہو کہ وقت کے اندر وضو کر سکیں گے وہ اجتماع گاہ میں پانی ہوتے ہوئے تیمم کر کے نماز پڑھ لیں یہ بتانا تو مشکل ہے کہ کتنے فی صد لوگوں نے پانی کے ہوتے ہوئے تیمم کر کے نماز پڑھی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس اعلان کے بعد خاصے لوگوں نے تیمم سے نماز ادا کی۔

(مذہب اور جدید ذہن ص ۲۴ از ڈاکٹر مشیر الحق)

یہاں پر ملاحظہ فرمایئے صراحۃً مسئلہ موجود ہے کہ ایسے موقع پر تیمم جائز نہیں ہے وضو کر کے نماز پڑھی جائے خواہ نماز قضا ہی پڑھنی پڑے، مگر جب ان حضرات نے دیکھا کہ یہاں بھیڑ ہے دوسری جگہ پانی لینے کے لئے جانے میں نفس کو تعب ہوتا ہے تو اپنی طرف سے

وضو کو ساقط کر دیا، ایسی حالت میں جن لوگوں نے ان حضرات کے اس غلط اجتہاد پر عمل کر کے تیمم سے نماز پڑھی ان سب لوگوں کی نمازیں ضائع ہوئیں، لہٰذا اب ان کے ذمہ اپنی ان نمازوں کی قضا پڑھنا لازم ہے۔

ان حضرات نے فجر کی نماز کو بھی نماز جنازہ و نماز عید پر قیاس کر لیا جو کہ صحیح نہیں ہے، چونکہ تیمم کے باب میں فقہاء کرام نے عبادات کی دو قسم کی ہیں، ایک وہ جن کے فوت ہونے کے بعد انکا بدل موجود نہیں جیسا کہ نماز جنازہ و نماز عیدین وغیرہ، دوسرے وہ جنکا بدل موجود ہے جیسا کہ صلوٰۃ وقتیہ، جمعہ، اور وتر کہ اگر یہ فوت ہو جائیں تو انکا بدل موجود ہے چنانچہ ادا کا بدل قضا اور جمعہ کا بدل ظہر ایسی صورت میں اگر وضو کے انتظار میں وقت کے چلے جانیکا خوف ہو تب بھی تیمم درست نہیں ہے، ضروری ہے کہ وضو کر کے نماز پڑھے خواہ قضا ہی پڑھنی پڑے، اور اگر احتیاطاً تیمم کر کے نماز پڑھ بھی لی جائے تب بھی وقت گذرنے کے بعد وضو کر کے نماز پڑھی جائے

ما؎ وکذا اذا خاف فوت الوقت لو توضأ لم یتیمم ویقضی ما فاتہ لان الفوات الیٰ خلف وھو القضاء۔ (ہدایہ ص۳۸ ج ۱)

ما؎:۔ اسی طرح اگر یہ خوف ہو کہ اگر وضو کیا جائیگا تو وقت نکل جائیگا تب بھی تیمم نہ کرے اور وقت گذرنے کے بعد وضو کر کے فوت شدہ نماز پڑھ لے، چونکہ یہاں پر فوت ہونے والی نماز کا بدل موجود ہے۔ اور وہ قضاء ہے۔ (ہدایہ)

۲؎ ولا یتیمم لفوت جمعۃ و وقت ولو وترًا لفواتہا الیٰ بدل وقیل یتیمم لفوات الوقت قال الحلبی فالاحوط ان یتیمم ویصلی ثم یعید (در مختار ص ۱۶۴ ج ۱)

اسی بنا پر بعینہٖ اسی صورت کے متعلق جو یہاں پیش آئی ہے فقہاء کرام نے تصریح کی ہے۔

۳؎ لو ازدحم جمع علی بئر لا یمکن الاستقاء منہا الا بالمناولۃ او کانوا عراۃ لیس معہم الا ثواب یتناوبونہ وعلم ان النوبۃ لا تصل الیہ الا بعد الوقت فانہ لا یتیمم ولا یصلی عاریا بل یصبر عندنا الیٰ قولہ وان خرج الوقت (رد المحتار ص ۱۵۵ ج ۱)

۲؎۔ اور نماز جمعہ یا نماز پنجوقتہ یا وتر کے جاتے رہنے کے خوف سے تیمم نہ کرے چوں کہ ان کے فوت ہونے پر ان کا بدل موجود ہے، اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ وقتی نماز فوت ہونے کے لئے تیمم کرے، امام حلبیؒ نے فرمایا کہ احوط یہ ہے کہ ایسی حالت میں تیمم کر کے نماز پڑھ لے مگر بعد میں وضو کر کے اس نماز کو لوٹا لے (در مختار)

۳؎۔ اگر کسی کنویں پر ایسا ازدحام ہو جائے کہ وہاں باری باری پانی لینے کے علاوہ کوئی صورت پانی لینے کی نہ ہو یا اسی طرح کسی جگہ کچھ لوگ ننگے ہوں اور ان کے پاس سوائے ایک کپڑے کے اور کپڑا نہ ہو، اسی کو باری باری پہن کر نماز پڑھتے ہوں، اور یہ بات معلوم ہو کہ میری باری وقت کے گذر جانے کے بعد آسکے گی ایسی صورت میں بھی تیمم کر کے یا ننگے ہونے کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہیں، بلکہ ہمارے نزدیک ایسی صورت میں رُکے رہنا چاہیئے خواہ وقت گذر جائے بعد میں وضو کر کے یا کپڑا پہن کر نماز کی قضا پڑھنی چاہیئے۔ (شامی)

۴؎ واذا خاف فوت الوقت لو توضأ لم يتيمم و يتوضأ و يقضي ما فاته (شرح البداية ص۵۶ ج۱)

ان تصریحات سے معلوم ہوا کہ مذکورۃ الصدر صورت میں ازدحام کی وجہ سے وقت کے اندر وضو پر قدرت نہ ہونے کی وجہ سے تیمم کر کے نماز پڑھ لینا درست نہیں تھا۔

الحاصل یہ تو اس صورت کا حکم ہے جس کا فوت ہونے کے بعد بدل موجود ہے، اور پہلی صورت جس میں فوت ہونے کے بعد کوئی بدل موجود نہیں ہوتا جیسا کہ نماز عیدین اس میں البتہ اس کی اجازت ہے کہ ایسی صورت میں تیمم کر کے نماز میں شریک ہو جائے چونکہ اس کا بدل موجود نہیں ہے۔

۵؎ وجاز لخوف فوت صلوٰۃ جنازۃ او فوت عيد الی قوله لان المناط خوف الفوات لا الی بدل فجاز لکسوف وسنن رواتب۔ (در مختار ص۱۶۲ ج۱)

۴؎ ۔ اگر یہ خوف ہو کہ وضو کریگا تو وقت جاتا رہے گا تب بھی تیمم جائز نہیں وقت گذر نے کے بعد وضو کر کے قضا نماز پڑھے ۔ (شرح البدایہ)

۵؎ ۔ اور تیمم جائز ہے نماز جنازہ یا نماز عید کے فوت ہونے کے خوف سے اس لئے کہ مدارِ حکم یہ ہے کہ ایسی نماز کے فوت ہونے کے خوف سے تیمم جائز ہے، جس کا بدل موجود نہ ہو، پس نمازِ کسوف اور سنن رواتب کے فوت ہو جانے کے خوف سے بھی ان کے لئے تیمم جائز ہے ۔

اسی ایک مثال سے دیکھ لیجئے کہ فقہاء کرام نے کس درجہ تحقیق واجتہاد کے ساتھ احکام کو مستنبط فرمایا ہے، ذرا ذرا سے فرق سے حکم بدل جاتا ہے، حالانکہ وہاں تک ہماری نظر بھی نہیں پہنچتی اور اس کے باوجود ہمیں ہمہ وقت اجتہاد کی فکر لگی ہوئی ہے، غور کیجئے نماز کا مسئلہ کتنا اہم ہے کتنے لوگ غلطی میں مبتلا ہوئے اور ان کی نمازیں ضائع ہوئیں، یہ خرابی ہے ایسے جدت پسند حضرات کے اجتہادات فاسدہ پر عمل کرنے میں، اور پھر غضب یہ ہے کہ اپنے ان اجتہادات فاسدہ پر مختلف قسم کے عجیب وغریب دلائل پیش کیے جاتے ہیں۔

(۱۲) ائمہ سلف بھی ہم جیسے انسان تھے تجدد پسندوں کا دعویٰ

کہا جاتا ہے کہ ائمہ سلف بھی بہرحال ہم جیسے انسان تھے وہ حضرات نبی نہیں تھے لہٰذا ان سے بھی غلطی ہوسکتی ہے، ایسی صورت میں یہ کیسے کہا جائے کہ جو کچھ ائمہ سلف نے اپنے اجتہاد سے لکھا ہے وہی حق ہے، لہٰذا ان کی تقلید کی جائے۔

اس سلسلہ میں گذارش ہے کہ بیشک مجتہد نبی نہیں ہوتا، اس سے بھی خطا ہوسکتی ہے جیساکہ باب اجتہاد میں ہم لکھ چکے ہیں المجتہد یخطی ویصیب مگر اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ اس احتمال کی وجہ سے

ان کی تقلید نہ کی جائے چونکہ اجتہاد تو ہوتا ہی وہاں ہے جہاں کوئی حکم منصوص صریح موجود نہیں ہوتا اور دلائل دونوں جانب موجود ہوتے ہیں، ایسے مواقع پر مجتہدین اپنے نورِ اجتہاد سے خاص اصول وضوابط کے تحت مختلف وجوہِ ترجیح کی بنا پر کسی ایک جانب کو راجح قرار دیتے ہیں، ایسی حالت میں مسئلہ مختلف فیہ میں خطا وصواب کے دونوں احتمال ہوتے ہیں، اسی لئے مجتہد اپنے اجتہاد کو صحیح محتمل خطا قرار دیتے ہیں -

مگر اس سے حضرات شائقینِ اجتہاد کو باب اجتہاد کے کھولنے کے لئے کوئی دلیل نہیں مل سکتی چونکہ احتمال خطا کی وجہ سے ان کا ناقابل تقلید ہونا ثابت نہیں ہوتا اور نہ ہی تجدد پسند حضرات کا مجتہد ہونا ثابت ہوتا ہے،

مثال کے طور پر آپ کسی حکیم یا ڈاکٹر سے دوا لیتے ہیں وہاں بھی مرض کی تشخیص یا دوا کی تجویز میں حکیم سے خطا ہونے کا احتمال موجود ہے، مگر اس احتمال خطا کے باوجود جس کا بار بار تجربہ بھی ہوتا رہتا ہے کہ بسا اوقات حکیم سے دوا یا مرض کی تشخیص میں غلطی ہو جانے کی وجہ سے شفا نہیں ہوتی پھر بھی حکیم یا ڈاکٹر سے علاج کرانے کے سلسلہ میں ان کی رائے پر اعتماد کیا جاتا ہے

چونکہ معلوم ہے کہ گو یہاں احتمالِ خطا موجود ہے مگر چونکہ ہم صاحب فن نہیں ہیں، لہٰذا ہمیں مرض کے علاج کے لئے ضرور کسی صاحب فن پر اعتماد کرنا پڑے گا۔

الغرض دنیوی معاملات میں ہم رات دن احتمال خطا کے باوجود اجتہادی امور میں ان اصحاب فنون پر اعتماد کرتے ہیں جو ان فنون میں کامل دسترس رکھتے ہیں، مگر بعینہٖ یہی اعتماد کا معاملہ جب دینی علوم میں پیش آتا ہے تو ایک ایسا شخص جسے وضو کے فرائض بھی معلوم نہیں امام اعظم پر طعن کرتا ہے اور بیباکی سے کہتا ہے کہ جب ان کے اجتہاد میں خطا کا احتمال موجود ہے تو پھر ان کی تقلید کیوں کی جائے، کیا امام ابو حنیفہؒ نبی تھے۔

حیرت کا مقام ہے کہ دنیوی علوم میں تو ہم رات دن اپنے سے بڑے صاحب علم کی تقلید کرتے ہیں، حالانکہ ان دنیوی علوم کا کچھ ضروری حصہ تو ہمیں حاصل بھی ہوتا ہے مگر یہاں علوم شرعیہ کا تو ضروری حصہ بھی ہمیں حاصل نہیں، اس کے باوجود ان اصحاب صدق وصفا اساطین علم اہل اجتہاد پر حرف زنی کی جاتی ہے جن کے علم وتقویٰ کے مقابلے میں ہماری حیثیت ایک طفل مکتب کی سی ہے، حدیث شریف میں اسی حرف زنی کو علامات قیامت سے

قرار دیا ہے۔

حق تنقید کسے حاصل ہے

(۱۳) کہا جاتا ہے کہ کسی کی شخصیت تنقید سے بالاتر نہیں ہے، حالانکہ یہ امر مسلم ہے کہ کسی صاحب فن پر تنقید کرنے کے لئے یعنی اس کا کھرا کھوٹا صحیح غلط پہچاننے کے لئے اس سے زیادہ یا کم از کم اس کے برابر تو علم ہونا ضروری ہے ورنہ صرف چند معلومات کی بنا پر ان ائمہ عظام پر تنقید کرنا خود اپنی جہالت و جسارت بے جا کی دلیل ہوگی۔

لہٰذا اگر آپ امام ابو حنیفہؒ پر تنقید کر رہے ہیں تو ضرور آپ کا علم ان سے زیادہ یا کم از کم ان کے برابر ہونا ضروری ہے اس کے بغیر ان پر تنقید کا حق آپ کو حاصل نہیں ہے۔

چنانچہ ان حضرات ائمہ کرام پر تنقید کا منشا، ہماری جہالت ہی ہوتی ہے، چونکہ ائمہ کرام سے مسائل کے ساتھ ساتھ دلائل منقول نہیں ہیں، بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ مسئلہ کی دلیل مجتہد کے پاس ہوتی ہے مگر وہ منقول نہیں ہوتی، اب جن لوگوں کی نظر ان دلائل پر نہیں وہ اپنی بے علمی کی بنا پر ان مسائل پر تنقید شروع کر دیتے ہیں۔

(۱۴) آج کے دنیوی

احتمال خطا کے باوجود دنیوی علوم میں تقلید

علوم میں سائنس حالانکہ ایک تجرباتی علم ہے مگر اس کے باوجود سائنسی مسائل میں سائنسدانوں کے اندر شدید اختلاف رہا ہے مختلف زمانوں میں کسی ایک ہی مسئلہ کے متعلق ان کی رائیں بدلتی رہتی ہیں جس سے ان کی اجتہادی خطا ثابت ہوتی رہتی ہے مگر اس کے باوجود سائنسی علوم میں ان کی تقلید کو ترک نہیں کیا جاتا، من وعن ان کے نظریات کو تسلیم کیا جاتا ہے، اور عالم انسانیت پر ان کا احسان تسلیم کیا جاتا ہے۔

مگر بعینہٖ اسی طرح جب ان حضرات مجتہدین کے اجتہادات کا مسئلہ آتا ہے جنہوں نے اپنی پوری زندگیاں ان علوم دینیہ کی خدمت میں صرف فرمائی ہیں تو طرح طرح کے اعتراضات و تنقیدات کے ذریعہ ان حضرات کی تنقیص و توہین کی جاتی ہے، تنقید میں ایسا طرز اختیار کیا جاتا ہے گویا وہ حضرات سلف ہمارے مقابلے میں دین سے بالکل ناواقف تھے۔

آخر دنیوی علوم کے ماہرین کی قدر و عظمت اور دینی علوم کے ماہرین پر تنقید و اعتراض کی وجہ سوائے دنیا اور اہل دنیا کی

قدر دانی اور دین اور اہل دین کی ناقدری کے کیا ہو سکتی ہے ۔

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان حضرات سلف ائمہ مجتہدین کا تمام امت پر تا قیامت احسان عظیم ہے، اگر یہ حضرات علماء ربانیین اپنی زندگیوں کو ان علوم دینیہ کی خدمت میں فنا کر کے ان علوم شرعیہ کو مدون نہ فرماتے تو آج صحیح دین کو سمجھ کر عمل کرنا دشوار تھا۔ ہر ذی رائے اپنی خواہش کے مطابق دین کی تعبیر کرتا اور حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیتا جیسا کہ آجکل کے مدعیان اجتہاد کے اجتہادات فاسدہ کی مثالیں ہمارے سامنے آرہی ہیں ۔

دشمنان اسلام مستشرقین کی کورانہ تقلید

(۱۵) اس سلسلہ میں یہ بھی ایک عجیب کرشمہ ہے کہ ہمارا یہی جدت پسند طبقہ جو ائمہ دین پر طعن کرتا ہے دشمنانِ اسلام کافر مستشرقین کے بتائے ہوئے اسلام کو بے دلیل تسلیم کرلیتا ہے ۔ ہر مسئلہ میں ان کی کورانہ تقلید کرتے ہیں، جو کچھ وہ سرگروہ اشارے کرتے ہیں یہ حضرات ان کی شرحیں کر ڈالتے ہیں، ان کی تحقیق کے سامنے اپنی عقل و فہم قابلیت و علمیت حتیٰ کہ دین و مذہب سب کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں ۔

مگر جب اسی دین کی شرح و تحقیق ان ائمہ عظام کی طرف سے

کی جاتی ہے جو ہر طرح اس کے اہل ہیں، تو ہمارا یہ جدت پسند طبقہ اسے قبول کرنا اپنی توہین قرار دیتا ہے اور ذہنی غلامی خیال کرتا ہے ان کی اپنی عقل و خرد کا غزور ان تشریحات کو قبول کرنے سے عار دلاتا ہے، اور کہہ دیا جاتا ہے کہ آج کے نئے دور کو نئے اجتہادات کی ضرورت ہے۔

ہمارے اس جدت پسند طبقے کو اہل حق کی ناقدری کی دنیا ہی میں یہ سزا ملی ہے کہ یہ حضرات اہل حق کے بجائے دشمنانِ اسلام کفار کو اپنا دینی امام تسلیم کئے ہوئے ہیں، بھلا اس سے بڑھ کر نادانی اور جہالت کیا ہو سکتی ہے۔ اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

حالاتِ زمانہ کی تبدیلی

(۱۶) سب سے مضبوط اور کارگر دلیل ان حضرات کے پاس حالات زمانہ کی تبدیلی کی ہے، کہتے ہیں چونکہ اب زمانہ بدل گیا، لہٰذا اب دین میں تجدید کی ضرورت ہے، یہ پہلوں کے اجتہادات اس سائنسی دور کے لئے کافی نہیں ہیں، لہٰذا آج کے جدید ذہن کو اسلام کے قریب لانے کے لئے نئے دور کے مطابق دین کی نئی تشریح کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ یہ تو ایک اجمالی بیان ہے، آپ ذرا بالتعیین نشاندہی کیجئے کہ آخر آج دین کے کونسے مسائل میں نئے حالات کی بنار پر نئی تشریح کے پردے میں ترمیم وتنسیخ کی ضرورت ہے تاکہ پھر بنیادی طور پر ان مخصوص مسائل پر گفتگو کی جائے۔

اجمالی طور اتنا عرض ہے کہ دین کوئی انسانوں کا بنایا ہوا قانون نہیں ہے جس میں مختلف وجوہات کی بنار پر ہمیشہ تبدیلی ہوتی رہتی ہے، یہ دین تو اللہ تعالیٰ علیم وخبیر کی طرف سے قیامت تک کے لئے کامل مکمل طور پر بھیجا گیا ہے، لہٰذا اب اس میں کوئی ترمیم وتنسیخ نہیں ہوسکتی۔ ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہے کہ قیامت تک پیش آنیوالے مسائل کا جواب دین کے اندر موجود ہے۔

اجتہاد کے نام پر تحریف

(۱۷) حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات حالاتِ زمانہ کی تبدیلی اور جدید رجحانات کا ہوّا دکھا کر دین کی جدید تشریح وتدوین کے نام سے ایک نیا دین مدون کرنا چاہتے ہیں، اپنی اس منشار کو پورا کرنے کے لئے مسئلہ اجتہاد کی آڑلی جاتی ہے، چنانچہ مسلم پرسنل لار کے سلسلہ میں دیکھ لیجئے تعدد ازدواج، مہر کی تحدید، یتیم پوتے کی میراث وغیرہ کے صریح احکام میں یہ لوگ تجدید کے نام سے اجتہاد کی دعوت دیتے ہیں

حالانکہ صریح اور منصوص احکام میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے،
جن وجوہات کو ان مسائل میں تحریف کے لئے پیش کیا جاتا ہے
وہ آج کی نئی پیداوار نہیں ہیں ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی ۔
خیر القرون میں بھی وہ وجوہات موجود تھیں، اگر ان وجوہات کی بنا پر
ان احکام میں تبدیلی ہوتی تو اب سے پہلے ہو چکی ہوتی، ان حضرات کو
اس کی زحمت گوارا کرنی نہ پڑتی ۔

اس بیان سے یہ امر بخوبی واضح ہو گیا کہ ان حضرات کا اصل
منشا اجتہاد کے نام سے دین میں ترمیم و تنسیخ، تبدیل و تحریف کے
ذریعہ ایک ایسا دین ایجاد کرنا ہے جو ان حضرات کی جدت پسندی
عقل پرستی، آزاد خیالی اور ہوائے نفسانی کے مطابق ہو ۔

لیکن یہ واضح رہے کہ اگر خدانخواستہ اس طرح کوئی نیا دین ایجاد
بھی کر لیا گیا جیسا کہ کیا جا رہا ہے تو وہ بالکل ایک جداگانہ دین ہو گا ۔
اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہ ہو گا، لہٰذا اب اس مذہب کا نام اسلام
کے بجائے عقلی نظام خام رکھا جائے گا ۔

جدید ذہن کی صحیح رہنمائی کا صحیح طریق

یہیں سے یہ بات بھی اچھی طرح سمجھ
لینی چاہئے کہ آج کے عقل پرست سائنس زدہ جدت پسند مرعوب زمانہ

اذہان کی اگر صحیح رہبری مقصود ہے اور انھیں دین کی طرف لانا ہے تو اس کے لئے دین کے مسلمات کو بدلنے کی ضرورت نہیں ہے صحیح طریقہ یہ ہے کہ حسب استطاعت حکمت و موعظت حسنہ کے ساتھ ان کو دین کے احکام سمجھائے جائیں اور یہ ذہن نشیں کرایا جائے کہ یہ اصول تو آپ کو ایمان ہی کے اندر تسلیم کرنا پڑے گا کہ شریعت کے احکام کو قبول کرنا ہماری یا آپ کی عقل میں آنے پر موقوف نہیں ہے بلکہ ان احکام کے منجانب اللہ نازل ہونے کی صداقت پر ہے۔

اب اگر ان حضرات کو دینی مسائل میں کچھ شکوک و شبہات ہوں تو ان کو رفع کیا جائے اور ان مسائل کی صداقت و حقانیت ذہن نشیں کرائی جائے، بس ہمارا کام اتنا ہی ہے، آگے منوا دینے کے ہم مکلف نہیں، چونکہ یہ انسان کے اختیار سے باہر ہے۔

انسان کی عقل محدود ہے

مثلاً ان حضرات کو سمجھایا جائے کہ جس طرح آدمی کے دیکھنے اور سننے کی قوتیں محدود ہیں، غیر محدود نہیں ہیں، ان میں سے ہر ایک کی ایک حد معین ہے، لہٰذا اس حد سے آگے کی چیز کو اگر ہم نہ دیکھ سکیں یا نہ سن سکیں تو یہ ان کے نہ ہونے کی دلیل نہیں ہے بلکہ ہماری نظر کی کوتاہی ہے۔

اسی طرح یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ ہماری قوت عقل بھی غیر محدود نہیں ہے بلکہ محدود ہے، اگر اس محدود دائرے میں عقل سے کام لیا جائے تو یہ انسان کا بڑا کمال ہے، مگر اس دائرے سے آگے اس عقل سے کام لینا عقلمندی نہیں ہے بلکہ بے عقلی ہے، اگر ہماری محدود عقل سے آگے کوئی حقیقتِ واقعہ موجود ہے تو محض ہماری عقل میں نہ آنے کی وجہ سے اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ علیم وخبیر کی تمام حکمتوں تک تو انسان کی عقل کی کیا رسائی ہوتی اس کا تو یہ حال ہے کہ ایک اپنے جیسا انسان جس کو فن طب میں مہارت حاصل ہے آپ کے لئے دوا تجویز کرتا ہے اب آپ کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ اس دوا کی تجویز میں کیا حکمت ہے، مرض کے علاج میں کیا تاثیر ہے مگر اس کے باوجود حکیم کی تجویز پر اعتماد کر کے اس دوا کو استعمال کیا جاتا ہے، صرف اس دوا تاثیر کے عقل میں نہ آنے کی وجہ سے اسے خلافِ عقل قرار دے کر ترک نہیں کیا جاتا۔

اسی طرح یہاں احکام شرعیہ میں سمجھ لینا چاہئے کہ کسی حکم کی مخصوص حکمت و مصلحت اگر ہماری عقل میں نہ آوے تو ہماری محدود عقل میں خدا کی لامحدود حکمتوں کے نہ آنے کی وجہ سے اس حکم کو خلاف عقل یا

خلاف حکمت و مصلحت قرار نہیں دیا جاسکتا ۔

الحاصل بندہ کو جب یہ معلوم ہوگیا کہ یہ خدا کا حکم ہے، اس پر عمل شروع کردے، چونکہ یہ قاعدہ ہے کہ حاکم سے محکوم صرف حکم معلوم کرسکتا ہے کہ حکم کیا ہے، یہ نہیں پوچھ سکتا کہ یہ حکم کیوں ہے، جب انسانوں میں بھی جہاں حاکم و محکوم کا تعلق ہے یہ قاعدہ مسلم ہے تو پھر احکم الحاکمین، خالق و مالک، عالم الغیب والشہادہ کے حکم کے متعلق یہ سوال کرنا کہ یہ حکم کیوں ہے کتنی بڑی نادانی اور ناانصافی ہے اور جب اپنی جہالت کی وجہ سے اس کی حکمت ہماری سمجھ میں نہ آوے تو اس حکم کا انکار یا اس میں ترمیم و تنسیخ کرنا کتنا بڑا ظلم اور ناانصافی ہے

الحاصل اس جدت پسند ذہن کے سامنے دین کی تبلیغ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اسلام کی عظمت و حرمت، حقانیت و صداقت کا ان کو پوری طرح تعارف کرایا جائے، اب اگر ان میں صحیح طلب ہوگی اور دوسرے باطل خیالات سے خالی الذہن ہوکر غور کریں گے۔ تو انشاء اللہ العزیز ضرور آپ کی تبلیغ سے ان کو فائدہ ہوگا ۔

بخلاف اس کے اگر آپ نے ان کی جدت پسندی کی خاطر اسلام کے بجائے ایک نیا دین ایجاد کردیا تو یہ اسلام کی تبلیغ کے بجائے اسلام کی تحریف ہوگی، جس کا حشر یہ ہوگا کہ انسان خدا کا بندہ

بننے کے بجائے بندۂ نفس بن کر رہ جائے گا۔ ہر وہ چیز جو نفس پر شاق گذرے گی اسے ضرر وحرج کا نام لے کر دین ہی کی فہرست سے خارج کر دیا جائے گا جیسا کہ مشاہدہ ہو رہا ہے، اللّٰھم احفظنا منہ۔

نادان دوستوں کی مثال

اور اس کی مثال بعینہٖ وہی ہو جائے گی کہ جیسے کسی بادشاہ کا شکاری باز غلطی سے کسی بڑھیا کے ہاتھ لگ گیا تھا، اس نادان دوست نے ازراہِ ہمدردی اس کے پنجے اور چونچ وغیرہ مڑے ہوئے دیکھ کر قلم کر دیئے۔

جو ہمدردی اس نادان بڑھیا نے شاہی باز کے ساتھ کی تھی، بعینہٖ یہ ہمارا جدت پسند طبقہ وہی ہمدردی دین کے ساتھ کر رہا ہے اور ظلم یہ ہے کہ پھر اسے بڑا تجدیدی کارنامہ قرار دیا جاتا ہے۔ ع

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست

اسرار وحِکم کو احکام کی علت قرار دینا غلط ہے

بعض مرتبہ اس تجدیدی کارنامے کے لئے ان اسرار وحِکم کو آڑ بنایا جاتا ہے جنہیں لطائفِ علمیہ کے طور پر بعض سلف مثل امام غزالی، امام رازی، حضرت ابن تیمیہ وابن قیم، حضرت شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

نے اپنی بعض تصنیفات میں ذکر کیا ہے۔

حالانکہ وہ اسرار و حکم احکام کی علت نہیں ہیں، جن پر مدار حکم ہوتا ہے، مگر یہ حضرات اپنی لاعلمی کی وجہ سے ان مصالح کو مدار حکم قرار دے کر اپنے اجتہادات فاسدہ کے لئے راہ نکالتے ہیں اور پھر اجتہاد کے نام پر ایسی ایسی تحریفات کرتے ہیں جن کی دین میں قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

بعض اسلاف پر عدم تقلید کا الزام

بعض ابنائے زمانہ شائقین اجتہاد اپنے نظریہ عدم تقلید کے ثبوت کے سلسلہ میں بعض اسلاف کے اسمار گرامی پیش کرتے ہیں اور بالعموم عوام کا اور بعض خالی الذہن اہل علم کا ایسی شخصیتوں کے نام سے متاثر ہونا ایک فطری امر ہے، حالانکہ یہ امر اہل تحقیق سے مخفی نہیں ہے کہ جن حضرات کے اسمار گرامی یہ لوگ پیش کرتے ہیں وہ سب اسلافِ کرام تقلید کے قائل تھے اور خود بھی ائمہ کرام کے مقلد تھے اور اگر گاہے بعض مسائل میں ان حضرات کا دوسرے دلائل کی بنار پر دوسری جانب رجحان ہوا بھی ہے تو اکثر رجوع فرمالیا ہے۔

جیسا کہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کا واقعہ ہے کہ انھوں نے

رفع یدین شروع فرمادیا تھا مگر پھر حضرت شاہ عبدالعزیزؒ کے ارشاد کے مطابق حضرت شاہ عبدالقادرؒ کے سمجھانے پر ترک کر دیا، چنانچہ جب حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے ارشاد فرمایا کہ میں مردہ سنت کو زندہ کرنے کے لیے رفع یدین کر رہا ہوں، تو حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے فرمایا کہ یہ حکم تو اس وقت ہے جبکہ سنت کے مقابلے میں خلاف سنت ہو، اور یہاں سنت کے مقابلے میں خلاف سنت نہیں ہے بلکہ دوسری سنت ہے، یہ سن کر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے رجوع فرمالیا۔

تنبیہ چونکہ ان حضرات شائقین اجتہاد کی کتابوں میں اکثر اس قسم کی مغالطہ آمیز ذہن کو خراب کرنے والی باتیں ہوتی ہیں لہٰذا ہرگز ہرگز ایسے جدید الخیال غیر محقق حضرات کی کتابیں مطالعہ نہ کرنی چاہئیں۔

شریعت کے بنیادی اصول کی جدید تشریح

اس جدت پسند طبقہ کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ شریعت کے بنیادی اصول کو لے لیا جائے اور پھر ان کی آج کے جدید ذہن کی منشاء کے مطابق نئے حالات کی روشنی میں جدید تشریح کی جائے۔

درحقیقت یہ تحریف کا منصوبہ ہے، جس کا ان حضرات نے خود ہی انکشاف کیا ہے، منشاء یہی ہے کہ اس طرح دین کے بنیادی اصول لے کر ان کی اپنی من مانی شرح کرلی جائے، اور فقہ و حدیث، تفسیر و کلام سب علوم دینیہ کا یہ کہہ کر انکار کر دیا جائے کہ یہ سب کچھ سابقہ زمانوں کے مخصوص حالات کے مطابق دین کی تشریح تھی، آج کے نئے زمانے کو نئی تشریح کی ضرورت ہے، لہٰذا آج کا فقہ و کلام، تفسیر و حدیث وہ ہے جسے آج کے زمانے کے مطابق چند بنیادی اصول کو سامنے رکھ کر ہم پیش کر رہے ہیں۔

مقام حیرت ہے یہ سب جدت پسندیاں ان لوگوں کو شریعت کے بارے میں سوجھتی ہے، یہی لوگ ملکی قانون کے بارے میں کبھی یہ مشورہ نہیں دیتے کہ صاحب ان تمام قانونی دفعات اور پھر انکی مخصوص تشریحات کی کیا ضرورت ہے، بس قانون کے چند بنیادی اصول لے لئے جائیں، اور ان کی اپنی منشاء کے مطابق آج کے جدید حالات کے مطابق تشریح کرلی جائے۔

چونکہ ان لوگوں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ سرکاری قانون کے صرف چند بنیادی اصول کو لے کر ان کی من مانی تشریح کر لینے کے ہم مجاز نہیں ہیں، سرکار کے مقرر کردہ اصول کی وہ تشریح سرکاری طور پر مسلم ہوگی جو

خود سرکار کی جانب سے منظور شدہ اشخاص کی طرف سے کی جائے گی ہر کس و ناکس کی تشریح معتبر نہیں۔

لہٰذا ہم اگر اپنی سمجھ سے قانون کے اصول کی وہ تشریح کریں گے جو سرکار کی جانب سے منظور شدہ تشریح کے خلاف ہو گی تو ہم سزا کے مستحق قرار پائیں گے، مگر یہی لوگ جب خدا کے دین کا مسئلہ آتا ہے تو بڑی بے باکی سے کہہ دیتے ہیں کہ اب نئے زمانہ کو نئے حالات کے تحت دین کی نئی تشریح کی ضرورت ہے، اور یہ نہیں دیکھتے کہ ہم ایسا کرنے کے خدا کی طرف سے مجاز بھی ہیں یا نہیں۔

اسلام کو خواہشات کے تابع کرنے کی سعی

آج کل حالاتِ زمانہ کا اس درجہ غلبہ ہو گیا کہ خواہشاتِ نفس اور حالاتِ زمانہ کو تو اصل قرار دیا جاتا ہے اور نعوذ باللہ دین کو اس کے تابع کیا جاتا ہے، اس سے ان کا مقصود یہ ہے کہ ہم زمانے کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں۔ ہر وہ چیز جس کو زمانہ کے حالات ہماری خواہشات کے مطابق ضروری قرار دیں حلال اور جائز ہو، جہاں کہیں کسی حکم شرعی میں مشقت نظر آئے یا اپنی خواہش نفس کے خلاف واقع ہو وہ حکم شرعی ساقط کر دیا جائے۔

اسی طرح اصل ہماری خواہشات ہوں، ان کے مطابق ہم زندگی

گذاریں اور اسلام کا نام بھی ہمارے ساتھ لگا رہے۔ نعوذ باللہ من ذٰلک۔

مقامِ غور ہے جب اصل تو حالات اور خواہشات ہوں گی، اور اسلام کو ان کے تابع بنا دیا جائے گا، تو پھر انسان خدا کا بندہ کہاں رہا وہ تو اپنی خواہشات کا بندہ ہو گیا۔

کون سے مسائل اجتہاد طلب ہیں

جب ان جدت پسند مغلوب زمانہ شائقین تجدید حضرات سے دریافت کیا جاتا ہے کہ ذرا انگلی رکھ کر بتایئے کہ نئے حالات کی روشنی میں اجتہاد طلب مسائل کونسے ہیں تو اکثر منصوص احکام مثلاً تعدد ازدواج یتیم پوتے کی میراث، نکاح وطلاق وغیرہ کے مسائل کو پیش کیا جاتا ہے، حالانکہ وہ احکام صریح ہیں، جن میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

اور پھر جن حالات کو ذکر کر کے تبدیل و ترمیم کی خواہش کا اظہار کیا جاتا ہے وہ حالات آج کے زمانہ کی نئی پیداوار نہیں ہیں۔ ہمیشہ سے وہ حالات موجود ہیں، ان حالات کی بناء پر ان احکام منصوصہ میں اجتہاد کے نام سے ترمیم و تنسیخ کی راہ تلاش کرنا سراسر تحریف فی الدین ہے۔

نو پید مسائل کا حل

اگر کہا جائے کہ مثلاً ہوائی جہاز پر نماز، ریڈیو اور ٹیلیفون وغیرہ کی خبر، روزہ میں انجکشن نیز جدید معاملات کے مسائل نئے ہیں، لہٰذا ان کا حکم معلوم کرنے کے لئے اجتہاد کی ضرورت ہے۔

تو اس کا جواب یہ ہے کہ اس کے لئے کسی نئے اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے، حوادث و نوازل کے احکام مستنبط کرنے کے جو اصول مقرر ہیں، انھیں اصول و ضوابط کے مطابق مسائل مدونہ میں سے کسی مسئلہ پر قیاس کرکے ان جدید مسائل کا حکم معلوم کیا جائیگا، چنانچہ آج تک جتنے بھی جدید مسائل پیش آتے ہیں، ان میں سے کوئی ایک مسئلہ بھی آج بلا جواب باقی نہیں ہے۔ ہمارے اکابرین نے ان سب کا جواب دیا ہے اور آئندہ بھی جتنے مسائل پیش آئیں گے انشاء اللہ العزیز ان کا جواب دیا جائے گا۔

لہٰذا صرف ان چند نو پید مسائل کو آڑ بنا کر جن کا شرعی حکم مفصل بیان کر دیا گیا ہے، تمام مدونہ مسائل فقہیہ کا انکار کر دینا اس کا مطلب سوائے اس کے کیا ہو سکتا ہے کہ اصل تو ہمارا شوقِ اجتہاد ہے، اس کے لئے کوئی بھی بہانہ کسی طرح ہمارے ہاتھ آجائے تاکہ پھر اپنے اجتہاد سے اپنی حسبِ منشاء دین میں ترمیم و تنسیخ کر لیا

کریں۔

حکم کو بدلنے کا حق صرف حاکم کو ہوتا ہے

یہ امر مسلم ہے کہ اپنے حکم میں ترمیم و تنسیخ کا حق صرف اسی کو ہوتا ہے جس کی جانب سے وہ حکم صادر کیا جاتا ہے، کسی ماتحت محکوم کو ہرگز ہرگز کسی حکم میں ترمیم و تنسیخ کی اجازت نہیں ہو سکتی۔

اس مسلمہ قاعدہ کے مطابق یہاں بھی سمجھ لیجئے کہ اللہ تعالیٰ جو احکم الحاکمین ہیں خود اپنے حکم میں ترمیم و تنسیخ فرما سکتے ہیں جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ میں ایسا ہوتا رہا ہے۔

خداوند تعالیٰ کے علاوہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی احکام خداوندی میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ کا حق نہیں دیا گیا، اور جب یہ حق نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی نہیں عطا کیا گیا تو پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے علاوہ اور کسی کو یہ حق کس طرح مل سکتا ہے اور جب یہ ثابت ہے کہ خدا کے علاوہ احکامِ شرعیہ میں ترمیم و تنسیخ کا حق کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔

تو اب جو فرد یا جماعت اس کا ارتکاب کرے گی وہ یقیناً کفر و ضلالت، بغاوت و عصیان کی مرتکب ہوگی۔ لہٰذا ایسی جماعت خود

بھی گمراہ ہوگی اور جو لوگ ان کی اتباع کریں گے وہ بھی گمراہ ہوں گے

خلوص کے ساتھ قابلیت شرط ہے

کہا جاتا ہے کہ ہم یہ سب کچھ خلوص کے ساتھ دین کی خدمت سمجھ کر کر رہے ہیں، جواب یہ ہے کہ خلوص تو ایک قلبی کیفیت ہے، یہاں اس سے بحث نہیں ہے، اصل سوال یہ ہے کہ کیا کسی کام کو صحیح طور پر انجام دہی کے لئے صرف خلوص کافی ہے یا خلوص کے ساتھ کسی کام کو کرنے سے پہلے اس کام کی صحیح انجام دہی کے لئے پوری قابلیت کا ہونا لازمی ہے۔

مثال کے طور پر ایک شخص موٹر چلانا بالکل نہیں جانتا مگر انتہائی خلوص کے ساتھ وہ شخص کسی آدمی کو اس کی منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے کار چلانا شروع کردے، اور اپنی ناواقفی کی بنا پر منزل مقصود تک پہنچانے کے بجائے اسے دار آخرت میں پہنچادے گا، اور جب اس کی اس حرکت پر باز پرس کی جائے تو وہ شخص کہے کہ صاحب میں نے تو یہ کام نہایت خلوص کے ساتھ کیا ہے، تو کیا یہ جواب اس کے جرم کی برأت کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔

بغیر قابلیت اجتہاد کرنا خطا بر خطا ہے

کہا جاتا ہے کہ اگر آجکل

کے ان شائقین اجتہاد سے کوئی اجتہادی غلطی ہوجائے تو اس سے ان کے کارِ اجتہاد کو غلط قرار نہیں دیا جاسکتا، چونکہ مجتہد سے کبھی غلطی بھی ہوجاتی ہے جیسا کہ پہلے مجتہدین سے بھی رجوع ثابت ہے۔

جواباً عرض ہے کہ ان حضرات کے مجتہد ہونے ہی میں تو کلام ہے بیشک اگر یہ مجتہد ہوتے تو ان کی اجتہادی خطا قابل گرفت نہ ہوتی، مگر یہاں تو حال یہ ہے کہ ان حضرات کے اجتہاداتِ فاسدہ ہی ان کے غیر مجتہد ہونے کی دلیل ہیں، ایسے ایسے کھلے مسائل میں یہ لوگ اجتہاد کے نام پر تحریف کرتے ہیں جن کے اندر منصوص وصریح ہونے کی وجہ سے اجتہاد کی قطعاً کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔

اس کی مثال یوں سمجھ لیجئے کہ بسا اوقات اچھے ماہر ڈرائیور سے بھی غلطی ہوجاتی ہے، لیکن اگر کوئی صاحب موٹر چلانا بالکل نہ جانتے ہوں محض دوسروں کی دیکھا دیکھی موٹر چلانے لگیں اور جب اپنی لاعلمی اور جہالت کی بناء پر اس موٹر کو کہیں ٹکرادے تو اپنی صفائی میں کہنے لگے کہ اگر مجھ سے ایسا ہوگیا ہے تو اس میں کیا حرج ہے، میری ڈرائیوری میں اس سے کیا فرق آتا ہے، جبکہ اچھے اچھے ماہر ڈرائیوروں سے بھی ایسا ہوجاتا ہے۔

تو کیا کوئی عقل وانصاف کی عدالت اس شخص کے اس مہمل

جواب کو تسلیم کر سکتی ہے ہرگز نہیں، بعینہٖ اسی طرح یہاں بھی سمجھ لیا جائے کہ جب ان تجدد پسند حضرات کو منصب اجتہاد حاصل نہیں ہے تو پھر ان کو اجتہاد کرنے کا کیا حق حاصل ہے، پھر بلا حصولِ منصبِ اجتہاد، یہ شوقِ اجتہاد کیسا؟ بلا قابلیت اجتہاد کرنا تو خطا در خطا ہے

جدت پسند طبقہ کے عقائد کے نمونے

ان تجدد پسند شائقین اجتہاد حضرات کے مختلف طبقات ہیں، اوّل مستشرقین، دوم مستشرقین کے مقلدین، سوم وہ آزاد خیال حضرات جو مستشرقین کے مقلدین پر طعن کرتے ہیں مگر بلا قابلیتِ اجتہاد مجتہد بن جانے میں وہ بھی انھیں لوگوں کے ساتھ ہیں۔

دوسرے اور تیسرے طبقہ کے خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک اشکال کے جواب کے تحت مختلف نمبروں میں اس ذہن کا رد کیا گیا ہے۔

اب دوسرے طبقہ کے خیالات وعقائد کے چند نمونے انکی تحریرات سے پیش کیے جاتے ہیں۔

حوالہ ۱۔ وحدتِ ادیان کا مدار جزئیات کی یکسانیت پر نہیں بلکہ ازلی و ابدی حقائق کی وحدت پر ہے جو سب جگہ ایک ہیں،

یعنی وحدتِ انسانیت، وحدتِ الوہیت اور وحدتِ حقیقت اور حق کی اطاعت اور حق کی تلاش اور لگن، اور اسی کے مطابق زندگی کی رفتار یہی دین حق ہے اور یہی حق ایک ہے، کوتاہ نظر رنگوں کی رنگارنگی اور لباسوں کی تراش وخراش اور آواز کے زیر وبم اور لب ولہجے میں الجھ کے رہ گئے، (دین الٰہی اور اس کا پس منظر ص۱۱۷ از محمد مہر خاں ناشر مکتبہ جامعہ نئی دہلی)۔

حوالہ ۲ وحدتِ ادیان کا تخیل اس کے سوا کچھ نہیں کہ جس طرح آسمانی یا قدرتی نعمتیں عام ہیں، اسی طرح روحانی نعمتیں بھی عام ہیں جیسے خدا ایک ہے خدا کی مخلوق بھی ایک ہے اور خدائی دین بھی ایک ہے، زبانیں بے شمار سہی مگر مدعا رکلام ایک ہے اور اسی کا نام کلمۂ حق ہے۔ (دین الٰہی اور اس کا پس منظر ص۱۱۶)۔

حوالہ ۳ قرآن حکیم کا یہ ارشاد کتنا پُر حکمت ہے کہ خدا کی بندگی کسی جگہ کسی نام کے مکان اور کسی زبان میں کی جا رہی ہو، اس نام کا احترام اس مقام کا احترام سب انسانوں کا فرض اولین ہے۔ دربار صاحب، گورودوارہ، پوجا استھان، گرجا گھر، چرچ کلیسا تکیہ خانقاہ، مسجد وغیرہ وغیرہ عمارتیں اگرچہ سب کی سب اینٹ پتھر ہی کی بنی ہوتی ہیں، مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اس ذات بے ہمتا کی

نسبت سے پاکیزہ اور لطیف انسانی جذبات اور پاکیزگی قلب کی صحیح موجیں ہوتی ہیں جو مختلف عبادت گاہوں کی صورت میں مجسم ہوتی ہیں۔ (دین الٰہی اور اس کا پس منظر ص۸۳)

حوالہ ۴۷ ہندو دھرم جسے وہ تعریضاً کفر کے نام سے موسوم کرتے ہیں وہ کسی ازلی ابدی صداقت کا کفر یا بالفاظ دیگر انکار نہ تھا اور نہ ہے بلکہ وہ قدیم بھارت میں ظہور حق ہی کی ایک شکل تھی، کیونکہ خداوند عالم رب العالمین کی ازلی وابدی سنت کے مطابق ہندوستان میں مبعوث ہونے والے خدائی رسولوں اور پیغامبروں کی لائی ہوئی صداقتوں پر ایمان ہے، یہ کفر وہ بدنام کفر نہیں جو کسی صداقت کے انکار کا نام ہے بلکہ یہ کفر قدیم صداقت تھا جو قرآنی زبان میں اسلام ہی کہلاتی ہے اس حقیقت سے بے خبری یا اس کی طرف سے کم توجہی کی وجہ سے ان دونوں لفظوں کو دو رنگ کی عینک سے دیکھا گیا ہے جن لوگوں نے دین اسلام کی ابتدا ملک عرب سے چودہ سو سال پہلے بلند ہونے والی آسمانی آواز تک ہی محدود سمجھ رکھی ہے، انھوں نے اس سے پہلے ہندوستان میں بلند ہونے والی روحانی الہامی آسمانی یا خدائی آوازوں کو اپنی بے خبری سے کفر کا نام دے دیا تھا۔

(دین الٰہی اور اس کا پس منظر ص۲۳)

ان چند تحریرات میں ملاحظہ کیجئے ادیانِ منسوخہ کو کن کن پیرایوں میں حق اور مدارِ نجات قرار دیا گیا ہے ۔

وحدت ادیان کا باطل عقیدہ

یہ لوگ وحدتِ ادیان کے باطل عقیدے کی بنا پر ان تمام ادیان کو جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بعد منسوخ ہو گئے حق تسلیم کرتے ہوئے ان پر چلنے والوں کو ناجی قرار دیتے ہیں، اس طرح ان کے نزدیک خدا کی رضا کے حصول اور آخرت کی نجات کی خاطر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانا اور اسلام کا قبول کرنا ضروری نہیں ہے ۔

حالانکہ اگر یہ لوگ مسلمان کہلانے کے ناطے قرآن پاک کو خدا کی سچی کتاب سمجھتے ہیں تو خود قرآن ان کے باطل عقائد کی پر زور تردید کر رہا ہے ۔

چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ یعنی دین خدائے تعالیٰ کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے، اہلِ علم اس کو سمجھتے ہیں کہ یہ ترکیب مفید حصر ہے جس سے مضمون میں ایک گونہ قوت پیدا ہوگئی، اس سے اسلام کی فضیلت ظاہر ہے کہ وہ ایسا دین ہے کہ خدا کے نزدیک صرف وہی مقبول ہے، یہاں

پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ ادیان تو بہت ہیں، پھر اس کا کیا مطلب ہے کہ خدا کے نزدیک دین صرف اسلام ہی ہے، یوں فرمانا چاہیئے تھا کہ دین حق صرف اسلام ہی ہے، مطلق دین کو اس میں منحصر کرنا کیسا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حصر کے علاوہ یہ دوسرا مبالغہ ہے کیونکہ قاعدہ ہے المطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل کہ مطلق سے فرد کامل مراد ہوا کرتا ہے، پس ہر چند کہ مطلب تو یہ ہے کہ دینِ کامل اسلام ہی ہے، اور یہ حصر بلا کلام صحیح ہے، کیونکہ دوسرے بعض ادیان یا تو اصل ہی سے حق نہیں اور یا منسوخ ہیں مگر مطلق کو منحصر کرنے میں ایک قسم کا دعویٰ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ اسلام اب کامل دین ہے جس کے سامنے اور مذاہب اس قابل نہیں کہ ان کو دین کہا جائے، چنانچہ محاورات میں بولا جاتا ہے کہ بس حسین تو فلاں شخص ہے، جس میں دعویٰ ہے کہ اس کا حسن ایسا کامل ہے کہ دوسرے حسین اس قابل نہیں ہیں کہ اس کے سامنے ان کو حسین کہا جائے۔

اس ادعاء کی وجہ سے مطلق کا حصر کردیا جاتا ہے یہی صورت اس جگہ ہے، بس حاصل یہ ہوا کہ گو ادیان اور بھی ہیں مگر اسلام ایسا کامل و مکمل دین ہے کہ اس کے سامنے دوسرے ادیان دین

کہلانے کے مستحق نہیں۔

یہ فضیلت تو اس آیت میں مذکور ہے اور دوسری جگہ ارشاد ہے وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ کہ جو شخص اسلام کے سوا کسی دین کو طلب کرے گا وہ ہرگز قبول نہ ہوگا، یہاں حقیقت کے موافق کلام فرمایا گیا ہے کہ دوسرے مذاہب کو بھی دین کہہ دیا گیا مگر اسلام کے مقابلہ میں ان کو غیر مقبول قرار دیا گیا یعنی اسلام کے بغیر کسی دین کے اختیار کرنے سے نجات حاصل نہیں ہو سکتی۔

یہ دونوں آیتیں وحدتِ ادیان کے عقیدے کی صراحۃً تردید کر رہی ہیں، ان لوگوں کے اس عقیدے کا بطلان کیا جاتا ہے کہ نجاتِ اخروی کے لئے نبی آخر الزماں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔

عقیدۂ توحید تصدیق رسالت کو بھی مستلزم ہے

یہ لوگ عقیدۂ رسالت کے انکار کے باوجود اپنے آپ کو موحد کہتے ہیں، حالانکہ توحید کے معنیٰ یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو صفاتِ کمال سے متصف اور صفاتِ نقص سے منزہ سمجھے اور صفاتِ کمال میں سے ایک صفتِ صدق بھی ہے جس کے ساتھ خدا تعالیٰ کو متصف ماننا توحید کے

لئے ضروری ہے اور صفاتِ نقص میں سے ایک صفت کذب بھی ہے جس سے خدا تعالیٰ کو منزہ سمجھنا لازم ہے، ایک مقدمہ تو یہ ہوا، دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ قرآن میں فرماتے ہیں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہ اور قرآن کا کلام الٰہی ہونا دلائل عقلیہ سے ثابت ہے تو اس خبر کو بھی سچا سمجھنا واجب ہے، پس جو شخص آپ کی رسالت پر ایمان نہیں لاتا وہ خدا کو کاذب کہتا ہے اور جب کاذب کہا تو پھر اللہ تعالیٰ پر کہاں ایمان لایا پس ثابت ہو گیا کہ خدا تعالیٰ پر ایمان لانا بدون تصدیقِ رسالت کے ممکن نہیں ۔

اسلام کے معنیٔ اصطلاحی کے بجائے معنیٔ لغوی مُراد لینا جہالت ہے

اسلام کے معنیٔ اصطلاحی کو چھوڑ کر ان لوگوں نے معنیٔ لغوی مراد لئے تاکہ رسالت کی تصدیق کے بغیر بھی ایک شخص کو مسلمان کہا جا سکے چنانچہ انھوں نے اسلام کے معنیٔ لغوی "گردن نہادن" مراد لے کر اسلام کے مفہوم کو وسیع کیا تاکہ ہر وہ شخص جو رسالت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے بغیر اپنی مرضی و خیال کے مطابق کسی طرح بھی خدا کی فرمانبرداری و اطاعت کا مدعی ہو، اس کو مسلمان قرار دیا جا سکے ۔

حالانکہ یہ قاعدہ کلیہ مسلمات سے ہے کہ کسی لفظ کے اصطلاحی معنیٰ میں استعمال ہونے کے بعد اس کے معنیٰ لغوی مراد نہیں ہوا کرتے، اگر اس طرح اصطلاحی معنیٰ کو چھوڑ کر ہر جگہ لغوی معنیٰ مراد لیے جائیں تو تمام نظام شریعت درہم برہم ہو کر رہ جائے گا، نیز اگر صرف معنیٰ لغوی کافی ہوتے تو محض قرآن پاک کا نازل ہونا کافی تھا، ان الفاظ کے معنیٰ شرعی بیان کرنے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث نہ فرمایا جاتا

اب یہاں دیکھئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے معنے اصطلاحی کیا بیان فرمائے ہیں، بخاری شریف کی ایک روایت ہے جس میں حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لا کر آپ سے اسلام کے متعلق سوال فرماتے ہیں ۔

قال یا محمد اخبرنی عن الاسلام قال ان تشهد ان لا الٰه الا الله وان محمداً رسول الله وتقیم الصلوٰة وتوتی الزکوٰة وتصوم رمضان وتحج البیت ان استطعت الیه سبیلاً۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام نے ایمان و اسلام کے متعلق حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس لئے سوال فرمایا تاکہ ان دونوں کا شرعی مفہوم واضح اور معین ہو جائے، اور اس کے بعد کسی ملحد و مفتری کو دجل و فریب کی گنجائش نہ نکل سکے، اسی حکمت کے

اظہار کی خاطر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان واسلام کے بارے میں سوالات کے ان جوابات کو دین کی تعلیم ارشاد فرمایا ہے،

تمام امت نے اسلام کو انھیں معنیٰ میں سمجھا ہے، تمام امت کے خلاف اگر کوئی شخص آج اسلام کے من گھڑت معنیٰ بیان کرے تو کتنی بڑی جسارت وتحریف ہوگی، اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ نعوذ باللہ من ذلک آج تک تمام امت نے جو اسلام کا مفہوم سمجھا ہے وہ صحیح نہیں ہے، صرف ان چند جدت پسند لوگوں نے اسلام کا صحیح مطلب سمجھا ہے، جس شخص کے دل میں ذرہ برابر بھی ایمان ہوگا وہ کبھی ایسی جرأت نہیں کرسکتا۔

اہل کتاب نے بھی یہی کہا تھا

جو کچھ آج کا جدت پسند طبقہ کہہ رہا ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اہل کتاب نے بھی یہی کہا تھا کہ ہمارے لئے نبی آخرالزماں پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے، انبیاء سابقین پر ایمان لانا اوران کی شریعتوں پر عمل کرنا کافی ہے، حالانکہ وہ تمام شریعتیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد منسوخ ہو چکی تھیں، مگر وہ لوگ ہمارے ان جدت پسند لوگوں کے طبقے کی مانند نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَ اَحِبَّآؤُهٗ کے غرور میں مبتلا رہے۔

قرآن پاک میں اس باطل غرور کا جواب کس صراحت کے ساتھ دیا گیا ہے، قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكَافِرِينَ۔

ایک دوسری جگہ ارشاد ہے مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللّٰهَ دیکھئے نجات کے لئے اور ہدایت یافتہ ہونے کے لئے اگر رسول پر ایمان لانا ضروری نہ ہوتا تو اہل کتاب کو اتباع رسول کا حکم کیوں دیا جاتا، چونکہ وہ خدا پر تو ایمان رکھتے تھے، آسمانی کتابوں کو بھی تسلیم کرتے تھے، انبیاء سابقین کے بھی قائل تھے، مگر اس کے باوجود مسلمان ہونے کے لئے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا ضروری قرار دیا، اور جن لوگوں نے ان صریح احکام کے باوجود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی تصدیق نہیں کی ان کے متعلق صاف صاف اعلان کر دیا گیا، إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ وَالْمُشْرِكِينَ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ فِيهَا أُولٰئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ۔

اگر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد بھی ادیان منسوخہ پر چلنا نجات کے لئے کافی تھا، نبی آخر الزماں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لانا شرط نجات نہیں تھا تو پھر اہل کتاب کو

کافر قرار دے کر ہمیشہ کے لئے جہنم کی سزا کا حکم کیوں فرمایا گیا، جبکہ ان کا مذہب حق تھا اور بقول ان لوگوں کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد بھی کسی صحیح الاصل سابقہ مذہب پر عمل کرنا نجات کے لئے کافی ہے تو اہل کتاب کو ناجی ہونا چاہیئے تھا نہ کہ ناری، اور قرآن نے اہل کتاب کو ناری قرار دیا ہے، پس معلوم ہوا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو تسلیم کیئے بغیر ادیان منسوخہ میں سے کسی بھی دین کو مدار نجات خیال کرنا سراسر جہالت ہے -

ادیانِ منسوخہ کی مثال حکومت سابقہ کے قوانین کی جیسی ہے

ادیانِ منسوخہ کی مثال حکومت ہائے سابقہ کے قوانین جیسی ہے کہ اپنے زمانے میں وہ تمام حکومتیں درست اور ان کے قوانین اس ملک کی رعایا کے لئے واجب التسلیم ہوتے ہیں مگر ان حکومتوں کا دور گذر جانے کے بعد ان کے قوانین پر عمل کرنا جرم قرار دیا جاتا ہے مثال کے طور پر اگر کوئی شخص آج کے دور میں انگریزی عہد کے ان قوانین پر عمل کرنے لگے جو منسوخ ہو چکے ہیں تو اسے مجرم اور باغی قرار دیا جائے گا -

نیز دوسری حکومت کے بجائے ایک ہی حکومت مختلف اوقات

میں مختلف قوانین بناتی ہے، بعض مرتبہ پارلیمنٹ کی جانب سے پہلا وزیر اعظم جو قوانین نافذ کرتا ہے، دوسرے وزیر اعظم کے ذریعہ ان کو منسوخ کر دیا جاتا ہے۔

اب یہاں دوسرے وزیر اعظم کے عہد میں پہلے وزیر اعظم کے قوانین کی اتباع نہیں کی جاتی چونکہ وہ منسوخ ہو چکے ہیں، اور نہ یہ تاویل قبول کی جاتی ہے کہ چونکہ وہ قوانین منسوخہ بھی پارلیمنٹ ہی کی جانب سے تھے لہٰذا ان پر عمل کر لینا بھی کافی ہے۔

اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ نبی پیغامبر ہوتا ہے، بانیٔ مذہب نہیں ہوتا، بانیٔ مذہب خداوند تعالیٰ وحدہٗ لاشریک کی ذات ہے، اسی لئے نبی بھی احکام میں ترمیم و تنسیخ نہیں کر سکتا، پس جب خداوند تعالیٰ نے نبی آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ پہلے تمام ادیان کو منسوخ فرما دیا، اور آپ کو کامل شریعت عطا فرمادی تو اب آپ کی اس شریعت کی اتباع لازم ہوگی اور پہلی شریعتوں پر عمل کرنا نجات کے لئے کافی نہ ہوگا۔

چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لَوْ کَانَ موسیٰ حیًا ما وسعہ الا اتباعی (مشکوٰۃ) اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام باوجودیکہ نبی ہیں مگر جب آپ دنیا میں تشریف لاویں گے تو حضور اکرم

صلی اللہ علیہ وسلم کے متبع اور آپ کے امتی ہوں گے، پھر بھلا اور کسی کو کیا حق ہے کہ وہ کسی منسوخ دین کی اتباع کر کے نجات کا طالب ہو۔

الحاصل ادیان منسوخہ کی پیروی کی مثال بعینہ ایسی ہی ہے، جیسے آج کوئی شخص انگریزی دور کے قوانین کی پابندی کرے اور یہ کہے کہ چونکہ یہ قوانین بھی کسی زمانے میں ہندوستان کے اندر نافذ رہے ہیں لہٰذا ان پر عمل کرنا بھی درست ہے، جس طرح اس شخص کا یہ کہنا انگریزی عہد کے قوانین کی پابندی کے لئے وجہ جواز نہیں بن سکتا، اسی طرح یہاں بھی اسلام کے علاوہ کسی اور دین کی اتباع مدار نجات نہیں بن سکتی۔

تعجب ہے ہمارا جدت پسند طبقہ ادیان منسوخہ کو تو مدار نجات قرار دیتا ہے مگر ملکی قوانین منسوخہ کے بارے میں یہ لوگ کبھی یہ مشورہ نہیں دیتے کہ چونکہ وہ بھی کسی زمانے میں اسی ملک کے قوانین رہے ہیں لہٰذا ان پر اگر عمل کر لیا جائے تو کیا حرج ہے۔

مستشرقین کے باطل نظریات

اب بطور مثال ان مستشرقین کے باطل نظریات کے چند نمونے یہاں پر پیش کئے جاتے ہیں، جن کی یہ جدت پسند طبقہ پیروی کرتا ہے۔

(۱) آنحضرت کی بعثت کے فوراً بعد ہی آپ کا عمل اور تعامل مسلمانوں کی نئی جماعت کے لئے سنت بن گیا تھا، اور ماقبل اسلام کے طریقوں کی معیاریت ختم ہوگئی تھی، گولڈ تسہیر (بحوالہ بینات کراچی شمارہ ربیع الاول ۱۳۸۵ھ)

(۲) مسلمانوں نے بھی خود اپنے نبی کی سنت میں کافی اضافہ کیا ہے یہاں تک کہ مسلمانوں کے عام نتائج فکر اور اعمال کا مجموعہ سنتِ رسول کے نام سے موسوم ہوگیا، (اسنوک بحوالہ بالا)

(۳) سنتِ رسول کا تصور نسبتاً بعد کی پیداوار ہے ورنہ ابتدائی عہد میں مسلمانوں کے نزدیک سنت سے مراد خود مسلمانوں ہی کا عمل ہوا کرتا تھا، (ڈاکٹر جوزف شاخت حوالہ بالا)

مستشرقین کی کورانہ تقلید

دشمنانِ اسلام مستشرقین نے سنتِ رسول کے بارے میں جن باطل خیالات کا اظہار کیا ہے، ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب بانی ادارہ تحقیقاتِ اسلامی پاکستان ان کی کورانہ تقلید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

ان عالموں نے سنتِ رسول سے جو انکار کیا ہے تو اس کی وجوہات یہ ہیں کہ انھوں نے (الف) سنت کے مشمولات کا بڑا حصہ براہ راست ماقبل اسلام کے رسوم و رواج پر مشتمل پایا ہے، جس میں عربوں کا زیادہ

حصہ ہے۔

(ب) سنت کا ایک بڑا حصہ قدیم فقہاء کے آزادانہ غور و فکر کا نتیجہ ہے جنہوں نے ذاتی اجتہاد کی بناء پر موجودہ سنت یا تعامل کو سامنے رکھ کر استنباط و استخراج سے کام لیا، ان میں سب سے اہم ترین بات یہ ہے کہ ان قدیم فقہاء نے نئے نئے بیرونی عناصر کو بھی شامل کر لیا ہے جن کا ماخذ بالخصوص یہودی روایات اور بعض بازنطینی و ایرانی انتظامات و تعاملات تھے۔

(ج) اور آخری بات یہ کہ جب دوسری صدی کے اواخر اور تیسری صدی کے دوران حدیثوں کے رواج نے ایک ملت گیر تحریک کی صورت اختیار کر لی اور وہ ایک وسیع پیمانے کی مظہر بن گئی تو پرانی سنت کے یہ تمام مشمولات خود رسول اللہ کی طرف زبانی منسوب کر دیئے گئے اور سنت رسول کے نظریہ کی پناہ حاصل کر لی گئی۔

(ماہنامہ فکر و نظر جلد اول شمارہ ۱ ص ۱۲ بحوالہ ماہنامہ بینات کراچی)

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

ابتدائی دور کے مسلمانوں کی سنت کا حقیقی اور متعین مجموعہ بڑی حد تک خود مسلمانوں ہی کا پیدا کردہ تھا۔

(فکر و نظر جولائی ۱۹۶۳ء ص ۱۶ بحوالہ بینات کراچی ربیع الاول ۱۳۸۷ھ)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب سنت نبویہ کو ملت اسلامیہ کی تخلیق قرار دیتے ہیں، اسی طرح وہ قرآن و سنت کی کامل اور جامع تشریعی حیثیت کو بھی تسلیم نہیں کرتے، چنانچہ لکھتے ہیں۔

اگر ہم آنحضرت کی سیرت کو اس رنگ آمیزی سے الگ کر کے دیکھیں جو عہد وسطیٰ کے فقہار نے پیش کی ہے تو ہمیں یقینی طور پر ایسا کوئی رجحان نظر نہیں آتا کہ رسول اپنے وسیع ترین مفہوم میں صرف ایک قانون ساز تھے وقتاً فوقتاً کچھ انفرادی فیصلوں کو چھوڑ کر جن کی حیثیت محض ہنگامی واقعات کی ہوتی تھی آپ نے اسلام کی ترقی کے لئے بہت کم ہی عام قانون سازی کی طرف توجہ فرمائی ہے، خود قرآن مجید میں بھی اسلامی تعلیمات کا بہت تھوڑا سا حصہ ہے جس کا تعلق عام قانون سازی سے ہے لیکن خود قرآن مجید کا قانونی یا قانونی نما حصہ اپنی اس حیثیت کو پورے طور سے واضح کر دیتا ہے کہ اس کا تعلق خاص حالات و کوائف سے ہے، (بحوالہ ماہنامہ بینات کراچی شعبان ۱۳۸۶ھ)

اس تحریر کے جواب میں "بینات" میں حضرت مولانا امین الحق صاحب لکھتے ہیں۔

گویا قرآن و سنت عام تشریعی احکام سے اول تو خاموش ہیں اور اگر ان میں بہت تھوڑا سا حصہ قوانین کا ملتا بھی ہے تو اس کا تعلق

ان ہی خاص حالات وکوائف تک محدود تھا، اور اسلامی قانون کا طویل سلسلہ جو ہمیں ملتا ہے، یہ سب قرونِ وسطیٰ کے فقہاء کی رنگ آمیزی کا رہین منت ہے اور وہی فقہاء اس کے موجد ہیں، ڈاکٹر صاحب کا یہ نظریہ غلط ہونے کے باوجود ان کی اپنی ذہنی تراوش نہیں بلکہ واضح طور پر وہ گولڈ تسہیر کے نظریہ سے متاثر نظر آتے ہیں چنانچہ گولڈ تسہیر لکھتے ہیں۔

اسلام اور قرآن نے تو کسی چیز کی بھی تکمیل نہیں کی، اس کی تکمیل کا سہرا تو بعد کے آنے والی نسلوں کے سر ہے، خود قرآن نے بہت ہی کم احکام بیان کئے ہیں اور جو تھوڑے بہت بیان کئے ہیں وہ بھی اس قابل نہیں کہ اسلامی فتوحات کے نتیجے میں اسلام کے زیر نگیں آنے والی گوناں گوں اقوام وممالک اور ان کے مختلف ومتنوع معاشرہ کے تقاضوں کو پورا کرسکیں، قرآنی احکام تو سیدھے سادے عرب قبائل اور ان کے ذہنی، اخلاقی، معاشرتی اور اقتصادی ظروف و احوال تک محدود ہیں وہ بھلا فارس وروم وغیرہ متمدن اقوام کے لئے کیسے کافی ہوسکتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب اور یہودی اور کٹر متعصب گولڈ تسہیر دونوں کے نظریات کا مفہوم اور مقصد بالکل یکساں نظر آتا ہے، یہ ہے مستشرقین

کی کورانہ تقلید کا نمونہ اور تشابہت قلوبہم کی واضح مثال کہ جو کچھ مستشرقین دشمنانِ اسلام کہتے ہیں، یہ نام نہاد مسلمان مدعیان اجتہاد اس کی شرحیں کر ڈالتے ہیں اور رائی کا پہاڑ بنا کر کھڑا کر دیتے ہیں، ان کی تمام ریسرچ مستشرقین کی اندھی تقلید کے گرد اس طرح چکر لگاتی ہے جیسے کوئی سیارہ اپنے مدار پر گردش کرتا ہے، وہ الفاظ کے خوبصورت لبادے میں مستشرقین کے ہذیانات لپیٹ کر پیش کرتے ہیں، اور اُسے اسلامی تحقیق باور کراتے ہیں، چنانچہ اوپر کی سطور میں آپ ڈاکٹر صاحب کا یہ قول پڑھ چکے ہیں۔

قدیم فقہاء نے نئے نئے بیرونی عناصر کو بھی اس میں شامل کرلیا جن کا ماخذ بالخصوص یہودی روایات اور بعض بازنطینی وایرانی انتظامی معاملات تھے۔ (فکرونظر جولائی ۱۹۶۳ء صا۱۲)۔

ڈاکٹر صاحب کی اس عبارت کو جو بھی پڑھے گا وہ اسے فضول خرافات کا پلندہ اور خالص افترائی پروپیگنڈا قرار دے گا اور اسے یہ معلوم کر کے مزید افسوس ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب نے اسلامی قانون پر یہ تہمت اپنے مغربی اساتذہ کی کورانہ تقلید میں روا رکھی ہے، چنانچہ گولڈ تسہیر نے بطور احتمال یہ نظریہ پیش کیا تھا مگر ڈاکٹر صاحب نے ایمان بالغیب کے طور پر پورے اطمینان ویقین کے ساتھ اسے پیش کر دیا چنانچہ

گولڈ تسہیر لکھتا ہے۔

اور کچھ بعید نہیں کہ یہ تمام فقہی تعلیمات احکام فقہ اور مسلمانوں میں متداول تفصیلاتِ عقائد و عبادات بھی اسی طرح اجنبی تہذیبوں سے متاثر اور ماخوذ ہوں جیسا کہ جدید تحقیق و تنقیح نے مدلل طور پر ثابت کیا ہے کہ رومانی فقہ (بازنطینی قانون) کے واضح آثار علوم فقہ اسلامیہ میں صاف طور پر نظر آتے ہیں خواہ وہ اصولی و نظری پہلو سے ہوں یا احکام فرعیہ کے پہلو سے۔

حالانکہ عہد صحابہ و تابعین کے فقہاء نہ تو کسی رومانی و بازنطینی درسگاہ میں گئے نہ تاریخی طور پر کسی فقیہہ اسلام کا رومانی قانون سے استفادہ ثابت ہے، نہ کسی فقیہہ کے کتب خانے میں رومانی قانون کی کسی کتاب کا نام و نشان ملتا ہے، اس لئے گولڈ تسہیر اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ان خرافات کو "دیوانہ گفت وابلہ باور کرد" کے سوا کیا نام دیا جاسکتا ہے اور ستم یہ ہے کہ گولڈ تسہیر جس بات کو کچھ بعید نہیں کہہ کر بطورِ احتمال یہودی ذہنیت کی تسکین کے لئے پیش کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب اس کو یقینی حقائق کے رنگ میں پیش کرنا چاہتے ہیں گویا "پدر نتواں کر دپسر تمام خواہد کرد" اور ستم بالائے ستم یہ کہ گولڈ تسہیر تو صرف اسلامی قانون کے رومانی قانون سے متاثر ہونے کا مضحکہ خیز

دعویٰ کرتے ہیں، اور ڈاکٹر صاحب اس پر ایمان سوز اضافہ کرتے ہیں کہ ان تمام بیرونی عناصر کو تحریک حدیث کے ذریعہ رسول اللہ کی طرف منسوب کر دیا گیا۔

اسلامی تاریخ کا معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ حضرات محدثین اور ائمہ دین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کی حفاظت میں کسی بڑے سے بڑے انسان کی پرواہ نہیں کی، اور ایک ایک کر کے وہ تمام سوراخ بند کر دیئے جہاں سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف غلط بیانی راہ پا سکتی تھی۔

رہا یہ قصہ کہ اسلامی قانون رومی قانون سے متاثر ہے، یہ بھی سراسر افترا و بہتان ہے، سچ تو یہ ہے کہ اسلام کے پھیلاؤ نے خود دوسری تہذیبوں کو متاثر کیا ہے، مگر تاریخی طور پر یہ قطعاً ثابت نہیں کیا جا سکتا کہ معاذ اللہ اسلام دوسری تہذیبوں سے متاثر ہوا۔ بالخصوص رومی قانون کے بارے میں یہ دعویٰ کرنا کہ اسلام نے عقائد و عبادات سے لے کر انتظامی و معاشرتی معاملات تک میں اس سے استفادہ کیا، اور اسی استفادہ کی بنیاد پر اس نے انسانیت کو راحت و سکون کی دولت سے مالا مال کیا خود رومی قانون کا مضحکہ اڑانے کے مترادف ہے۔

سوال یہ ہے کہ رومی قانون پہلے سے موجود تھا اور دنیا کے عظیم خطے پر اسے تسلط واقتدار بھی حاصل تھا، آخر اس نے وہ کارنامہ کیوں نہ انجام دیا جو اسلام نے بالکل قلیل مدت میں انجام دے ڈالا، جو قوانین دنیا کو خود کچھ نہ دے سکے انسانیت کے کسی دکھ درد کا مداوا نہ کر سکے وہ بیچارے اسلام کو کیا دے سکتے تھے، اس لئے ڈاکٹر فضل الرحمٰن اور ان کے پیشرو گولڈ تسہیر کا یہ دعویٰ جہاں تاریخی طور پر غلط ہے وہاں عقل کی ترازو میں بھی پورا نہیں اترتا۔

اس عجیب وغریب تحقیق کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے کسی کروڑپتی کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جائے کہ اس نے یہ تمام مالی استفادہ فلاں فاقہ کش مفلس سے کیا ہے۔

اسلام پر مردہ قوانین سے استفادہ کی تہمت رکھنے والے اگر ہمت واستطاعت رکھتے ہیں تو آج اقوام عالم کے موجودہ قوانین ہی کے ساتھ اسلام کا تقابل کر دیکھیں تو انھیں اپنی جہالت معلوم ہو جائے گی۔

حاصل کلام مستشرقین اور ان کے مقلدین کے باطل خیالات کے چند نمونے صرف بطور مثال یہاں پیش کئے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ جو لوگ آج دین کی قیادت کے

لئے بے چین ہیں اور علمائے راسخین کو خشک ملائیت کا طعنہ دیتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ دین کے تمام دفتر کو اپنی خواہشات کے موافق بدل ڈالیں اور اس کا نام انھوں نے اجتہاد رکھا ہے۔

ان کے استاد مستشرقین دشمنانِ اسلام ہیں، ان کا علم و فکر سبھی انھیں کی زہر آلود تحریرات تک محدود ہے جیسا کہ گولڈ تسیہر اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے خیالات باطلہ میں آپ شاگرد و استاد کی مطابقت دیکھ چکے ہیں وقس علیٰ ھٰذا۔

ان مدعیانِ اجتہاد کے تمام نظریات اسی طرح مغرب سے برآمد کئے ہوئے ہیں۔

خاتمہ

الحمد للہ علیٰ احسانہ تقلید کا ثبوت اور اس کے دلائل، اجتہاد و قیاس کا بیان جدت پسند طبقے کے خیالات فاسدہ اور اشکالاتِ واہیہ کے جوابات ان کے اجتہادات و اعتقادات کے نمونے مستشرقین اور ان کے متبعین کے نظریات کی یکسانیت کو مختصر طور پر ذکر کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ اس مختصر سی تحریر کو قبول فرمائے، اور اسے تمام مسلمانوں کو عموماً اور جدت پسند مغرب زدہ حضرات کو خصوصاً نافع اور ان کے غلط خیالات کے لئے دافع

فرمائے۔ آمین یارب العلمین

وَآخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

مَلفُوظَات

○ ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ علم صحیح وہ ہے جو ٹیڑھا اور سیدھا کھرے کھوٹے، ہدایت اور ضلالت میں فرق کرادے، اگر یہ بات نہیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ کوئی فنی چیز ہو، اس کو علم نہیں کہہ سکتے، جیسے فن منطق، فن فلسفہ، فن ریاضی وغیرہ، یہ اصل میں فنون ہیں مجازاً ان کو علم کہہ دیا جاتا ہے، اگر یہ تمام علوم ہیں تو پھر سائنس اور ریاضی جاننے والے بھی صاحب علم ہوئے، اور صاحب علم کے بارے میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے وَاَنْزَلَ اللّٰہُ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَعَلَّمَکَ مَالَمْ تَکُنْ تَعْلَمُ وَکَانَ فَضْلُ اللّٰہِ عَلَیْکَ عَظِیْمًا ○ ترجمہ یہ ہے، اللہ نے آپ پر علم اور حکمت نازل فرمائی اور آپ کو ان چیزوں کا علم دیا جن کو آپ جانتے نہ تھے اور آپ پر اللہ کا بڑا فضل ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ صاحبِ علم پر حق تعالیٰ کا فضل عظیم ہے، تو ان سائنس والوں پر بھی فضل ہونا چاہئے حالانکہ ان کے لئے کوئی فضل نہیں ہے، پس قرآن پاک کے فیصلہ سے معلوم ہوا کہ علم وہی ہے جو ٹیڑھ سیدھ وغیرہ میں فرق کردے اور جس سے آخرت کا صحیح اور غلط راستہ معلوم ہوجائے۔

○ ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو شخصوں کے لئے تقویت اسلام کے لئے دعاء فرمائی تھی، ایک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے لئے اور دوسرے ابوجہل کے لئے، حضرت عمرؓ کے بارے میں دعاء قبول ہوئی جس کا قصہ مشہور ہے ابوجہل کے بارے میں قبول نہ ہوئی ایسا کیوں ہوا، اس کو حق تعالیٰ جانتے ہیں کہ عمرؓ میں ایسی کونسی بات تھی جس کی وجہ سے وہ مقبول ہوگئے اور ابوجہل مردود ہی رہا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمرؓ میں تعمیری، انتظامی، فتوحاتی، ایسی باتیں موجود ہوں جو ابوجہل میں نہ تھیں، اسی شان تعمیر اسلام کی وجہ سے حضرت عمرؓ مقبول ہوگئے، یہ حق تعالیٰ کے اسرار ہیں جن کو وہی خوب سمجھ سکتے ہیں عقل کی رسائی وہاں تک مشکل ہے ان اسرار میں زیادہ غور وخوض کرنا ضلال واضلال کا سبب ہوجاتا ہے، حق تعالیٰ کی حکمت غامضہ کو کون سمجھ سکتا ہے۔

چنانچہ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا واقعہ ہے کہ انھوں نے حق تعالیٰ سے عرض کیا، میں آپ کے اسرار دیکھنا چاہتا ہوں فرمایا کہ اچھا فلاں جگہ بیٹھ جاؤ، وہاں سے تم سب کو دیکھو گے تم کو کوئی نہ دیکھے گا، چنانچہ اس جگہ موسیٰ علیہ السلام بیٹھ گئے، دیکھا کہ ایک گھوڑا سوار آیا جس کے ساتھ ایک اشرفیوں کی تھیلی تھی، تھیلی رکھ کر قریبی دریا سے پانی پینے چلا گیا، پانی پی کر واپس آیا اور گھوڑے پر سوار ہو کر چل دیا، تھیلی وہیں بھول گیا، دوسرا شخص آیا اور وہ تھیلی لے کر چلا گیا، پھر تیسرا شخص آیا اور اس نے پانی پینا اور منھ ہاتھ دھونا شروع کیا، اس درمیان میں اچانک گھوڑے سوار کو اپنی تھیلی یاد آئی وہ واپس آیا، اس تیسرے شخص کو وہاں دیکھا یقین کر لیا کہ تھیلی اسی نے لی ہوگی، سوار نے اس سے تھیلی مانگی اس نے انکار کیا، اسی میں بات بڑھی سوار نے تلوار نکال کر اس شخص کی گردن ماردی اور چلتا بنا، موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ باری تعالیٰ یہ سمجھ میں نہیں آیا کہ تھیلی کوئی لے گیا اور مارا کوئی گیا یہ کیا راز ہے، ارشاد ہوا راز اس میں یہ ہے کہ تھیلی لے جانے والے کا اس سوار پر تھیلی کی مقدار قرضہ تھا وہ دینا نہ چاہتا تھا ہم نے اس طرح پہنچا دیا، اور مقتول نے سوار کے باپ کو قتل کر دیا تھا، سوار کا قصاص اس پر واجب تھا ہم نے

اس طرح قصاص دلوادیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا یا اللہ! آپ کے اسرار آپ ہی جانیں، پس حق تعالیٰ کے اسرار کو کون پہنچ سکتا ہے۔

○ ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ اخلاص سے عبادت کرنے والے اعمال ظاہرہ اور باطنہ بجالانے والے اور منہیات سے بچنے والے میں حق تعالیٰ کے ساتھ نسبت ضرور قائم ہو جاتی ہے، یہ نسبتِ باری تعالیٰ باخلاص قائم ہونے کے بعد اس کا سلب نہیں ہو سکتا، اور اگر کہیں اس کا سلب ہو گیا تو حقیقت میں وہاں قیام ہی نہیں ہوا تھا جیسا کہ شیطان میں عبادت تھی مگر باخلاص نہ تھی، اس لئے قیام نسبت ہی نہیں ہوا تھا جس کا ظہور سجدۂ آدم کے وقت ہو گیا، بلکہ بطور لطیفہ کے یوں کہنا چاہئے کہ شیطان میں جن ہونے کی وجہ سے جنون طبعی تھا، تمام عبادت جنون طبعی کے طور پر تھی اخلاص کے ساتھ نہ تھی، بعضوں کی طبیعت جنونانہ ہوتی ہے، ان کی عبادت و خدمت اسی طبعی جنون کا اثر ہوتی ہے اخلاص پر مبنی نہیں ہوتی۔

○ ایک سلسلہ گفتگو میں فرمایا کہ بعض مسلمان شبہ کرتے ہیں کہ جب کافر ناجائز طریقوں سے سود لے کر جوئے سے سٹے سے ظلم کر کے ترقی کر رہا ہے تو مسلمانوں کو بھی یہ طریقے اختیار کرنے چاہئیں

تاکہ ترقی ہو، پھر مسلمانوں کو ان طریقوں سے کیوں منع کیا جاتا ہے۔

جواب یہ ہے کہ خنزیر پاخانہ کھا کر موٹا ہوتا ہے، اس پر چربی چڑھتی جاتی ہے تو کیا بھینس بھی پاخانہ کھا کر موٹی ہو سکتی ہے ہرگز نہیں بلکہ رات دن دُبلی ہوتی جائے گی، کیونکہ خنزیر کا مزاج اور ہے اور بھینس کا اور، اسی طرح مسلمان کا مزاج اور ہے اور کافر کا مزاج اور، جو طریقہ کمائی کافر کے راس آتا ہے وہ ہرگز مسلمان کے راس نہیں آسکتا۔ اس کو خوب سمجھ لو، اس کی حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک عجیب مثال دیتے تھے، فرماتے تھے کہ مسلمان کی مثال ٹوپی جیسی ہے اور کافر کی مثال جوتے جیسی، ٹوپی پر اگر ذرا سی ناپاکی لگ جائے تو فوراً سر سے اتار کر دھویا جاتا ہے اور جوتے پر نجاست کی دھڑی جم جاتی ہے اور پیر میں رہنے دیا جاتا ہے، پس مسلمان کو کافر پر قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔

○ ایک سلسلۂ گفتگو میں فرمایا کہ رضا اور قرب حق تعالیٰ مقصود ہے، اور اس کا حصول ظاہر ہے ان اعمال پر موقوف ہے جو انسان کے اختیار میں ہیں، اور جو اعمال ایسے ہیں جو اختیار سے باہر ہیں مثلاً ہوا میں اُڑتے چلے جانا یا کشتی کے بغیر دریا کے پار ہو جانا یا اتفاق وقت سے دعا قبول ہو جانا یا اتفاق سے کوئی بات

دل کے موافق ہوجانا وغیرہ یہ باتیں ایسی ہیں کہ ان کو قرب و رضاء حق تعالیٰ میں کچھ دخل نہیں، یہ باتیں تو ایسی ہیں کہ ان کو مچھلی اور مکھی بھی کر دکھاتی ہے جیسا کہ رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کا واقعہ یاد آیا، یہ بڑی عابدہ، زاہدہ تھیں حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کی مریدنی تھیں، ایک مرتبہ جنگل میں حسن بصریؒ اور رابعہؒ کی ملاقات ہوئی، حسن بصری رحمۃ اللہ نے فرمایا رابعہ کہاں پھر رہی ہو آؤ دریا پر مصلی بچھا کر نماز پڑھیں حضرت رابعہ بصریہؒ نے فرمایا یہ کیا آیئے ہوا میں زمین اور آسمان کے درمیان مصلی بچھا کر نماز پڑھیں، یہ کہہ کر اڑیں اور ہوا میں مصلی بچھا دیا، حضرت حسن بصریؒ نے فرمایا کہ رابعہ ہماری پہنچ وہاں تک نہیں ہے، حضرت رابعہؒ نے فرمایا کہ حضرت نہ یہ کمال ہے جو میں نے کر دکھایا یہ تو مکھی کر دکھاتی ہے اور آپ نے جو کر دکھایا وہ مچھلی کر دکھاتی ہے، کمال تو کوئی اور چیز ہے اور وہ صرف اتباع سنت ہے،

دیکھئے اس واقعہ سے معلوم ہوا کہ یہ چیزیں مطلوب نہیں کہ غیر اختیاری ہیں، مطلوب تو قرب باری تعالیٰ ہے جو حاصل ہوتا ہے اعمال اختیاریہ ظاہرہ اور باطنہ سے ۔

اس واقعہ میں ایک اشکال و جواب ہے اور ایک فائدہ اشکال یہ ہے کہ پھر تو شاگردنی استاذ سے افضل ہوگئی کہ رابعہؒ ہوا میں

اڑ گئیں اور حسن نہ اڑ سکے، جواب یہ ہے کہ یہ ایک جزئی چیز ہے، اس سے فضیلت کلی حاصل نہیں ہوتی، فضیلت کلی حضرت استاذ ہی کو حاصل ہے کہ ان کے طفیل سے مریدنی میں یہ کیفیت پیدا ہوگئی، اور فائدہ یہ ہے کہ حضرت رابعہؒ کے جواب سے استاذ کا غایت ادب معلوم ہوتا ہے کہ اپنی مثال مکھی سے دی اور استاذ کو مچھلی سے تشبیہ دی، مکھی مچھلی کے مقابلہ میں بہت ہی حقیر ہے، نیز مکھی کسی کام کی نہیں، اگر کھانے میں گر جائے تو کھانے کو بھی دل نہ چاہے اور مچھلی کھانے کے لئے بہترین غذا ہے تو خود کو استاذ سے گھٹا دیا، واقعی جب دل میں کسی کی عظمت ہوتی ہے تو اندر کی عقیدت و عظمت ادب خود سکھلا دیتی ہے، آج کل تو سکھلانے سے بھی یہ چیزیں نہیں آتیں کیونکہ دل میں عظمت نہیں۔

ہماری مطبوعات

ختم البخاری

یہ بخاری شریف کے آخری باب کے درس کی تقریر ہے جو مسیح الامت حضرت مولانا مسیح اللہ خاں صاحب دامت برکاتہم کی مخصوص طرز تدریس کا شاہکار ہے، مضامین نہایت عجیب وغریب اور بعض تو محض الہامی ہیں، ناظرین خود اسکا مشاہدہ فرمالیں گے۔

مواعظ

مواعظ قسط اول وقسط دوم منظر عام پر آچکی ہیں، جن میں چھ وعظ ہیں جو حضرت مسیح الامت دامت برکاتہم کے خاص اندازبیان، شفقت ودلسوزی کی خاص نمایاں شان پر مشتمل ہیں، خوفِ الٰہی۔ تعلقِ الٰہی، خشیت الٰہی، وعظ والعصر، کلمہ طیبہ کے تقاضے، اخلاص۔ ناموں سے مضامین پر صاف دلالت ہے۔

ملفوظات

حضرت مسیح الامت دامت برکاتہم کی مجلس کے ارشادات [illegible] اشاعت کے پیہم تقاضوں کے سبب ہم نے فضیلت علم کے آخر [illegible] سلسلہ شروع کردیا ہے، بحمدہ تعالیٰ تقریباً اکیس بائیس ملفوظات آگئے ہیں، آئندہ قریب ہی ایک قسط مستقل لانے کا ارادہ ہے، حق تعالیٰ کامیاب فرمائیں۔

ناشر:- مکتبہ فیض اشرف جلال آباد ضلع مظفرنگر (یوپی)